# گلزارِ سخن

معہ

# گلدستہ

یعنی

پنڈت اوتار کرشن تکو اوتار بی ایس سی (گلاسکو)
ایم - آئی - ای (انڈیا)
ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انجنیر بی - این - آر
کی

غزلوں اور نظموں وغیرہ کا مجموعہ

۱۹۴۹ء
(مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی)

# گل زارِ سخن

پنڈت اوتا کرشن تکو اوتار

(ہمدرد پریس دہلی)

# فہرست گلزارِ سخن



پنڈت اوتار کرشن صاحب تکوّ اوتار

# پیش لفظ

تنقید کے اصول اور قاعدے چاہے کچھ ہی ہوں بعض معمولی باتیں ایسی ہیں کہ انسان نقد ونظر کے وقت اپنے تئیں ان سے بچا نہیں سکتا۔ سب سے پہلے اس کے اپنے پسند و ناپسند اور مذاق کی کسوٹی اس کے سامنے آتی ہے پھر وہ موجودہ ماحول اور عام مذاق کی ترازو اٹھاتا ہے۔ اور عہد حاضر کا مذاق اور رائج طرز کو سامنے رکھتا ہے۔ ایسی اور بھی کئی باتیں ہیں ان سے بچ کر ایک کلام کی جانچ کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اجتماعی ماحول تو ہوتا ہی ہے مگر ایک شاعر یا مصنف کا ایک اپنا ذہنی ماحول بھی ہوا کرتا ہے۔ اور یہ اس کے دل پسند مطالعے۔ حلقۂ احباب اور مشورۂ سخن کے ذرائع پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں اس مجموعے پر نظر ڈالنی ہے۔

پنڈت اوتار کرشن صاحب شاعر ہیں۔ ادبی مذاق ان کا اچھا ہے

ان کی نظموں کا ایک مجموعہ **گلدستہ** کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کتاب میں چند نظموں کے علاوہ ان کی غزلیں ہیں۔

ان پچاس برسوں میں جو تغیر عظیم غزل کی معنوی ترکیب و تنظیم میں واقع ہوا ہے اس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ غزل اپنی ابتدائی وضع سے بہت دور ہٹ گئی ہے اور ہر معنوی قید و قدغن سے آزاد ہو گئی ہے ایک صنف شعر کے اعتبار سے جہاں تک معنی یا موضوع کا تعلق ہے غزل کا بحیثیت غزل کے کوئی خاص معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی وہ معیار جس سے جانچ کی جا سکے۔

**گلدستہ** کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے ۔ "جن نظموں پر یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں اس شخص کے ذہن کی پیداوار ہیں جس کی تعلیم سائنس کے مضامین میں ہوئی اور زندگی بھر جس کا شغل ایسے صیغے میں رہا جسے ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔" اور چونکہ کلچر اور ابتدائی تربیت مضبوط ذوقی پس منظر بنا چکی تھی ادبیت ذہن سے وابستہ رہی۔ اوّل تو ان کی طبیعت داخلیت کے کونے کھدروں میں جھانکتی بھٹکتی نہیں اور پھر یہ کہ وہ دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں۔

ہوتمار صاحب کو اتفاق سے ابتدائی مشق سے لے کر مدت تک امیر مینائی کے سکول کے "درخشاں ستاروں" سے سابقہ رہا۔ انھیں کی صحبت انھیں سے مشورہ اور ان ہی کی ہدایت سے مستفید ہوتے رہے۔ وہی رنگ ان کے کلام کا ہونا تھا چنانچہ ہوا اور پک گیا۔ اب اگر آپ اصغر ود فانی۔

حسرت اور جگر کے دیوانوں کو سامنے رکھ کر **گلزارِ سخن** کا مقابلہ کریں گے تو یہ ٹھیک نہ ہو گا۔ اس مجموعے میں دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے جو طرز اختیار کیا اسے کیسا نباہا۔ کہاں تک اس میں کامیاب رہا۔

ایک شخص پنجاب کے ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوتا ہے۔ پنجاب ہی میں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے پھر وہ سائنس کی تعلیم کی تکمیل کے لئے انگلستان چلا جاتا ہے۔ وہ ایسی پر ریلوے انجینیری کے شعبے میں کام کرنے لگتا ہے اور اس وقت بنگال ناگپور ریلوے کے ڈسٹرکٹ انجینیر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ یہ اس کی غزل کی شاعری کا نمونہ ہے اس نظر سے آپ اس مجموعے کو دیکھیں تو دو حقیقتیں آپ کو ملیں گی۔ ایک یہ کہ اردو اور اس کے کلچر کی ہمہ گیری اور مستحسن تاثر بے شک عالمگیر ہے جو وقت اور مقام سے مبرا ہے اور یہ کہ اوتار صاحب واقعی شاعر ہیں اور جو رنگ ان کی شاعری کا ہے داد اور تحسین کا مستحق ہے۔ میں نے اس نظر سے اس مجموعے کو دیکھا اور مصنف کے ادبی ذوق اور ذہنیت کی صلاحیت کا مداح ہو گیا۔

زبان کی چاشنی بیان کی سلاست اور فصاحت اسلوب کی چستی اور ادا کی سہانی شوخی اور دلچسپی اور دوسری خوبیاں جن کی طرف آجکل توجہ نہیں ہوتی آپ کو اس مجموعے میں ملیں گی۔ جذبات عالیہ اور نفیس احساسات کی تصویریں بھی سامنے آئیں گی اور اپنی جھلکی دکھا جائیں گی تخیل کی بلند پروازی

نہیں نستعلیق چال کے ساتھ سُریلی آواز بھی ملے گی مگر کان پھوڑ بلند آہنگی نہیں کلام رواں دواں ہے۔ شوخی و طراری بھی لئے ہوئے ہے اور متین صلاحیت بھی۔ رہی حسن و عشق ہجر و وصال اور درد و درماں کے قصے ہیں مگر دل چسپ ہیں اور چوکھے رنگ ہیں۔ مضامین میں جدت نہیں مگر ندرت سے خالی نہیں کیا یہ کمال نہیں کہ اذنار صاحب نے اپنا کوئی نیا سکول شاعری کا ایجاد نہیں کیا مگر جس رستے پر چلے تھے اسے پوری خوبی اور خوش اعتقادی سے منزل مقصود پر ختم کیا۔ یہی نہیں کہ اس رستے سے بھٹکے نہیں بلکہ اسے خس و خار سے صاف بھی کیا۔ اس رنگ کو جسے اختیار کیا تھا خوب نکھارا اور چمکایا۔

جب کہ ناگزیر وجوہ سے ملک عزل و نصب کا اور معاشرت رد و بدل کا شکار ہو رہی ہے اور ادبی اداروں میں ایک قسم کی ہلچل پڑی ہوئی ہے۔ ایسی صورتوں میں گلزارِ سخن کی اشاعت نہایت غنیمت اور مبارک ہے۔ ادبی تفریح جو اس کے طفیل مہیا ہوگی بجھے ہوئے دلوں تڑپتے جذبات کو فرو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

آخر میں چند شعر اس مجموعے میں سے سرسری طور پر ادھر ادھر سے اٹھا کر یہاں دیئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کرام کو اذنار صاحب کے ذوقِ سخن کا اندازہ ہو سکے۔

نہ رہا اب کوئی تقدیر سے شکوا مجھ کو — راحتِ روح ہوئی ترکِ تمنا مجھ کو

ہم بیانِ حالِ زار کرتے ہیں — آپ سننے سے عار کرتے ہیں

ہے ترقی پہ اور جوشِ وفا — سختیاں وہ ہزار کرتے ہیں

موسمِ گل کے آتے ہی وحشی — پیرہن تار تار کرتے ہیں

وہ دن گئے کہ تھا تری خود داریوں پہ ناز — میں رو رہا ہوں تجھ کو دلِ زار دیکھ کر

پیشِ نظر ہے واقعہ طور و کلیم کا — ڈرتا ہوں دل کو طالبِ دیدار دیکھ کر

یہ شیوہ ہے بے رحم صید افگنوں کا — قفس میں بھی بلبل کے پر باندھتے ہیں

یا حُسن ان بتوں کو نہ پروردگار دے — یا عاشقوں کو دل پہ ہی کچھ اختیار دے

اک نظر ہی سے نہ سب کو دیکھیے — دوست دشمن میں ہے کچھ پہچان بھی

مٹائی ہم نے جب ہستی دل بھر تجھ کو پایا ہے — نشاں اپنا کیا قائم جہاں میں بے نشاں ہو کر

گردشِ جام بھی ہے رند بھی ہیں ساقی بھی — سحرِ میخانہ گھٹا آج تو چھائی ہوتی

کوئی قسمت بدل نہیں سکتا — جو لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا

دل اگر ہو تو نرم ہو جائے — سنگ لیکن پگھل نہیں سکتا

ہائے اوتار کا دلِ مضطر — اب سنبھالے سنبھل نہیں سکتا

ہے وفا کا بدل جفا اے دل — یہ زمانہ نہیں بھلائی کا

آپکو تر ہے آپ کو تر ہی — مئے انگور رہ نہیں سکتا

سوئے دیر و حرم نہ جا کہ خدا — اس قدر دور رہ نہیں سکتا

سب پند و وعظ حضرتِ ناصح بجا مگر — میں کیا کروں کہ دل ہی مرا دل نہیں رہا

تو پردۂ راز میں نہاں ہے — جلوہ ترا چار سو عیاں ہے

آئے گا وہ ضرور آئے گا — اے دلِ ناصبور آئے گا

جذبِ دل میں اگر اثر کچھ ہے — خود ہی وہ رشکِ حور آئے گا

مری چشمِ شوق و پُر آرزو مرے قلبِ عشق نواز میں
نظر آئیں ساری حقیقتیں جو نہاں تھیں پردۂ راز میں

ریاضِ دہرِ فانی میں وہ ناکامِ تمنا ہوں — حیاتِ چند روزہ ہو گئی صرفِ فغاں میری

قدرتِ صانع نظر آتی ہے ان کے حسن میں — ہو گیا عشقِ بتاں بھی جزوِ ایماں دیکھئے

ہمیں سے تم کو شکایت ہمیں سے رنجش ہے — ہمیں بُرے ہیں کوئی دوسرا بُرا نہ ملا

کس کو رقیب جانوں میں کس کا گلہ کروں — ہر اہلِ دل تمہارا طلبگار ہو گیا

وقار کی ہے اگر تمنا یہی ہے رازِ وقار اے دل
اٹھانا ہرگز کسی کا احساں کسی سے ہرگز نہ التجا کر

کچھ پتا آغاز کا چلتا نہیں — سوچنا بے سود ہے انجام کا

نہیں جو درد کا حامل اسے ہم دل نہیں کہتے — غلط ہے عشق کا دعویٰ اگر لب پر حرفِ شکوہ ہے

اوقاریوں کٹ رہی ہیں راتیں فراق کی — میں جاگتا ہوں اور مری تقدیر سوتی ہے

جو ہنستا ہے اسے ہنسنے دو جو روتا ہے اسے رونے دو
دستور یہی ہے دنیا کا کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے
تدبیر کرو کوشش بھی کرو جو کچھ بھی ہو بس میں وہ کر لو

سو بات کی ہر اک بات یہی جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے

نوٹ:- کچھ عرصے سے آپ نے آفتاب کی جگہ غمخوار تخلص اختیار کرلیا ہے۔
چنانچہ آخر کلام میں یہی تخلص آیا ہے۔

(برج موہن دتاتریہ کیفی)

# گلزارِ سخن

## ردیف الف

۱
ادا کیونکر کروں میں شکرِ احساں اے خدا تیرا — کہ میں تیرا ہوں اور جو کچھ ہے میرا وہ دیا تیرا
خداوندِ دو عالم نیک و بد سب تیرے بندے ہیں — برا تیرا بھلا تیرا، بھلا تیرا، برا تیرا
ترے جلوہ کی یکتائی کا عالم دیکھنے والے — وہی ہے جس کو کہتے ہیں حقیقت آشنا تیرا
حقیقت بیں نگاہوں سے حریمِ دل میں وہ دیکھے — جسے مطلوب ہے دیدارِ روئے پُر ضیا تیرا

تری چشمِ عنایت کی تمنا کیوں نہ ہو یا رب
کہ ہے اوتارؔ کو اس بیکسی میں آسرا تیرا

۲
حیراں ہر ایک زاہدِ جنت فروش تھا — میرے گناہ تھے تری رحمت کا جوش تھا
بزمِ طرب تھی، کیف تھا، جوش و خروش تھا — ساقی تھا فیض بخش میں ہی پیمانہ نوش تھا
بیتابِ دید کو جو تجلی ہوئی نصیب — نا آشنائے ہوش تھا پھر بھی تو ہوش تھا
صد شکر آج مر کے ٹھکانے تو لگ گیا — کل تک رہِ طلب میں جو خانہ بدوش تھا
پیری نے آ کے رنگِ تمنا بدل دیا — اب دل نہیں وہ جس میں تمنا کا جوش تھا

آہ و فغاں میں رات کٹی غم نصیب کی
اوتارؔ صبح ہوتے ہی ہوتے خموش تھا

۳

عاشقِ زار کا پھر چاک گریباں ہوگا — ہر اشارہ ترا جب حشر بداماں ہوگا
حسنِ یکتا تو بہر حال نمایاں ہوگا — غیرتِ حسن جسے ہوگی وہ پنہاں ہوگا
ہے جو دل دادۂ انداز و اداے قاتل — اے اجل کیوں ترا شرمندۂ احساں ہوگا
وقت ضائع نہ کر اے چارہ گرِ دردِ فراق — شربتِ دید سے اس درد کا درماں ہوگا
حسنِ کافر میں نظر شانِ خدا آتی ہے — دیکھنے والا ترا کیوں نہ مسلماں ہوگا
شمع بجھ جائے گی محفل میں خجل ہو ہو کر — شعلۂ آہ اگر بزم میں عریاں ہوگا
کوچۂ عشق میں جز غم نہیں کچھ بھی حاصل — حشر کیا تیرا بتا اے دلِ ناداں ہوگا
عاشقِ زار جو مر جائے گا شامِ فرقت — نوحہ خواں اس کی لحد پر غمِ ہجراں ہوگا
صورتِ شمس و قمر چرخ پہ ہے جلوہ فگن — تیرے عشاق کا داغِ دلِ سوزاں ہوگا
دل کو آشفتہ کیا گیسوئے پرخم نے تو کیا — جو پریشان کریگا وہ پریشاں ہوگا

تیری تقدیر جب اختر بدل جائے گی
جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہوگا

۴

عشق مجبور رہو نہیں سکتا — حسن مستور رہو نہیں سکتا
آبِ کوثر ہے آبِ کوثر ہی — مے انگور ہو نہیں سکتا
سوئے دیر و حرم نہ جا کہ خدا — اس قدر دور ہو نہیں سکتا
چشمِ ظاہر ہے دید سے محروم — دل تو بے نور ہو نہیں سکتا
ہم بھی ہوں گے نہ داخلِ جنت — تو اگر حور ہو نہیں سکتا

مردِ میدان ہو تو اگر اوتار
دور بھی دور ہو نہیں سکتا

مقصدِ عشق ہے الفت میں فنا ہو جانا ۵
شیوۂ حسن ہے مانوسِ جفا ہو جانا

بن گئی ہے شبِ فرقت شبِ وعدہ میری
ان کو منظور ہو اچھو جیسا ہو جانا

اوجِ تکمیل یہی۔ مقصدِ الفت ہے یہی
دل کو بھی چاہیئے اب غرقِ فنا ہو جانا

ہجر کی رات نہ نیند آئی نہ آئیگی کبھی
خواب کو ہے سببِ فرقت میں قضا ہو جانا

نہ یہ بھولا تھا نہ بھولا ہے۔ نہ بھولے گا کبھی
تیرا پہلو سے دلِ زار جدا ہو جانا

آرزو وصل کی پوری ہو یہ ممکن ہی نہیں
نظر آتا نہیں اس عقدہ کا وا ہو جانا

تیرِ مژگاں کو ترے تیرِ قضا کہتے ہیں
میری قسمت میں تھا اس کا بھی خطا ہو جانا

ان کو بھی آئے یقیں گریۂ و زاری کا مری
اشک کو چاہیئے سیلاب بلا ہو جانا

امتحاں اس کو سمجھ جوشِ وفا کا اے دل
اس ستم گار کا سرگرمِ جفا ہو جانا

زندگی قیدِ مسلسل ہے الم کی اے دل
غیر ممکن ہے بجز مرگ رہا ہو جانا

خوگرِ غم ہے ازل ہی سے دلِ یاس نصیب
اس کا اور درد کا مشکل ہے جدا ہو جانا

خوگرِ جور ہوں کیوں ترکِ جفا کرتا ہے
مجھ کو منظور نہیں تیرا خفا ہو جانا

یاد اوتار رہے وہ عشق کی سرمستی ہیں
تیرا ہر ایک پری رو پہ فدا ہو جانا

(۱۹۲۶ء)

عشقِ کامل کا ہمارے دل میں ساماں ہو گیا — ۶ حُسن یکتا تھا بس پردہ وہ عریاں ہو گیا

ناز تھا جس پر سمجھتے تھے جسے خالق کا گھر — ہائے وہ دل بھی حریفِ دین و ایماں ہو گیا

یاد کر کے ہے خدا کو دیکھ کر صورت تری — چاہنے والا ترا اب تو مسلماں ہو گیا

ضبط فریاد و فغاں سے ہو گیا ہے رنگ فق — آج ظاہر ان پہ اپنا رازِ پنہاں ہو گیا

یہ بھی چارہ گری عشقِ جنوں تاثیر کی — جب کبھی پہلو میں اٹھا درد درماں ہو گیا

دستِ نازک سے نہ اٹھا بارِ خنجر ہائے ہائے — قتلِ عاشق پر نظر تھی۔ خونِ ارماں ہو گیا

کھل گیا رازِ نہاں محفل میں رسوائی ہوئی — میں خجل تیرے سبب سے چشم گریاں ہو گیا

حاملِ جوشِ تصور ہو گئی تصویرِ یار — ذرہ ذرہ سے نمایاں حُسنِ جاناں ہو گیا

جذبۂ باطل کی حد تک تھا تیا ہم تفرقہ — عشق جب اس سے بڑھا خود حسنِ جاناں ہو گیا

رشکِ اوصافِ ملائک پر عبث ہے آبشر — وہ فرشتوں سے بھی اچھا ہے جو انساں ہو گیا

کیا کہوں حالت ہوئی کیا ہجر میں اوتار کی
قطرہ قطرہ خون کا صرفِ چشمِ گریاں ہو گیا

احساسِ دردِ عشق کا حاصل نہیں رہا — ہم جس کو دل سمجھتے تھے وہ دل نہیں رہا

راہِ طلب میں طائرِ دل ہے شکستہ پر — اب اس کو فکرِ دوریِ منزل نہیں رہا

یعنی ہیں پائمالِ نشیب و فرازِ دہر — وہ میں نہیں رہا وہ مرا دل نہیں رہا

سب پند و وعظ حضرتِ ناصح بجا مگر — میں کیا کروں کہ دل ہی مرا دل نہیں رہا

حُسنِ بتاں کے عشق کا لطف آشنا تو ہوں — اوتار کیا کروں وہ مرا دل نہیں رہا

کوئی اسکندر تھا دارا دوسرے کا نام تھا
بعد مرنے کے جو دیکھا ایک ہی انجام تھا

یار تھا گلزار تھا بادہ تھا دورِ جام تھا
میکشِ ناکام اک اوتارِ تشنہ کام تھا

موت کا آنا شبِ غم میں ہمیشہ کے لیے
عاشقِ حسرت زدہ کو عیش کا پیغام تھا

کوہکن نے عشق میں دی جانِ شیریں اسلئے
وہ تو اک مزدور تھا اور طالبِ آرام تھا

اس بتِ ناآشنا کو آشنا سمجھا تھا میں
وہ فریبِ آرزو تھا یا خیالِ خام تھا

دیر میں دیکھا اسے کعبہ میں بھی پایا اسے
اس جگہ رحمان کہتے تھے وہاں وہ رام تھا

آرزو پیدا ہوئی تو ہو گیا رخصت سکوں
جب دلِ بے مدعا تھا چین تھا آرام تھا

ہم گرفتارِ بلا پروازِ اوّل میں ہوئے
کیا خبر تھی آشیانے کے برابر دام تھا

کہتے ہیں اوتار بادہ کش جہاں سے اٹھ گیا
ہو بخیر انجام وہ اک رندِ مے آشام تھا

لطف و کرم ہے مجھ پہ خدائے کریم کا ۹ احسان مند ہوں میں گنہِ عظیم کا
خوفِ سزا اگر ہے تو امید عفو بھی مرکز ہوں جرم کر کے میں امید و بیم کا
مجھ کو قفس میں کچھ بھی چمن کی خبر نہیں آ جائے کاش ایک ہی جھونکا نسیم کا
چاہے اگر تو ہو لبِ جاں بخش سے شفا منت پذیر کیوں ہوں دوائے حکیم کا
کیوں کر مری نظر کو تجلی کی تاب ہو میں جانتا ہوں واقعہ طورِ کلیم کا

عاصی اگرچہ ہوں مجھے خوفِ جزا نہیں
اوتار معتقد ہوں میں لطفِ رحیم کا

آہ میں کچھ اگر اثر ہوتا ۱۰ لطفِ فریاد وہ فتنہ گر ہوتا
اشک جو صرفِ چشمِ تر ہوتا قطرۂ آب پھر گہر ہوتا
رہتا ناکام آرزو میں بھی خضر اگر میرا ہمسفر ہوتا
دیکھتے ہم تری اداؤں کو کاش تو حاصلِ نظر ہوتا
میری قسمت میں جب اسیری تھی کیوں مجھے شوقِ بال و پر ہوتا
ہے فنا باعثِ سکوں یعنی سر مرا صرفِ رہ گذر ہوتا
حسنِ خود بیں کو جاذب کر لیتے عشق ہوتا تو اس قدر ہوتا

عمر اوتار چین سے کٹتی
مائل لطف وہ اگر ہوتا

ناز ذروں کو خود نمائی کا ۱۱ راز ہے تیری کبریائی کا

دل دیا ہے تو جان بھی دیدے — حق ادا کر دے آشنائی کا
سعیِ مقصود کر عبث ہے گلا — بختِ تیرہ کی نارسائی کا
سر ہے اور سنگِ آستانِ صنم — وقت ہے قسمت آزمائی کا
ہائے کہنا کسی کا یہ دمِ صبح — آگیا وقت اب جدائی کا
اس کی ہر اک ادا ہے دشمنِ جاں — کشتہ ہوں شانِ دل ربائی کا
پر کٹے ہیں در قفس ہے بند — کوئی موقع نہیں رہائی کا
بوسہ دے دو ہٹا کے گیسو کو — صدقہ مل جائے رونمائی کا
وہی محوِ نگاہِ ساقی ہیں — جن کو دعویٰ تھا پارسائی کا
ہے وفا کا بدل جفا اے دل — یہ زمانہ نہیں بھلائی کا

معتقد ہے زمانہ اے اوتار
آج تیری غزل سرائی کا

۱۲

آئے گا وہ ضرور آئے گا — اے دلِ ناصبور آئے گا
جذبِ دل میں اگر اثر کچھ ہے — خود ہی وہ رشکِ حور آئے گا
جب کسی دل ربا کو دیکھیں گے — دل ہمارا ضرور آئے گا
زلف سرکے گی ان کے چہرے سے — چاند نکلے گا نور آئے گا
مے کوثر کا ذکر دنیا میں — بے پئے کیا سرور آئے گا
مفت اوتار ہو گیا رسوا — دیکھئے کب شعور آئے گا

۱۱

ہوا تیر آزما وہ شاہدِ ناوک فگن میرا
عدو بن کر کریگا کیا تو اے جیبِ کہن میرا

دلا کر یاد تڑپاؤ نہ قالبِ پُرمحن میرا
دیارِ غیر میں کیوں پوچھتے ہو تم وطن میرا

پسندِ خاطرِ احباب کی امید رکھتا ہوں
قبولِ عام ہو سکتا نہیں ہرگز سخن میرا

کہا گل نے بصد حسرت عبث شکوہ ہے گلچیں کا
چھڑایا میرے رنگ و بو نے جب مجھ سے چمن میرا

سنبھالا ہوش میں نے جب سے ہوں اک طائرِ بے پر
قفس ہے آشیاں صیاد کا گھر ہے چمن میرا

دلِ وارفتہ نے یہ رنگ بدلے راہِ الفت میں
یہی تھا رہنما میرا یہی تھا راہزن میرا

یہی اے دل اگر عالم رہے گا جوشِ وحشت کا
نہ ہوگا کچھ بجز عریانیِ تن پیرہن میرا

جہاں والے جسے خورشیدِ عالمتاب کہتے ہیں
حقیقت میں ہے وہ چھوٹا سا اک داغِ کہن میرا

ہمیشہ بادۂ گلگوں سے میں سرشار رہتا ہوں
ہوا مطلوب جب سے اک بتِ گل پیرہن میرا

سناؤں داستانِ غم کسے اوقار غربت میں
نہ مونس ہے نہ حامی ہے نہ کوئی ہم سخن میرا

۱۲

اوقار لطف اور بڑھے انتظار کا
جب اعتبار ہو کسی بے اعتبار کا

اُٹھتا ہے نالہ اس دلِ بے اختیار کا
کیا ذکر اب سکون و شکیب و قرار کا

ملتا ہے بوسہ گیسو و رخسارِ یار کا
ممنون ہوں میں گردشِ لیل و نہار کا

ذرّے کو تو نے مہرِ درخشاں بنا دیا
احسانمند ہوں کرمِ بے شمار کا

مجھ کو عبث اٹھاتے ہیں وہ بزمِ ناز سے
ممکن ضرور ہونا ہے پھولوں میں خار کا

مخمور ہو کے غم کو مٹاتا ہے بادہ کش
ہے میکشی بھی کام کسی ہوشیار کا

ظلمت کدہ کو نور کا منظر بنا دیا
مِنّت پذیر ہوں نفسِ شعلہ بار کا

شمس و قمر فلک پہ ہیں خجلت سے سرنگوں
اللہ رے فخر مرغ دل داغ دار کا

چلا آتا ہے متوالا شرابِ روح ۱۵ پرور کا
وہی اوتار جو طالب تھا کعبہ چشم دل بر کا

زباں پر وہم سے آتا نہیں جب نام دل بر کا
پتہ ملنا بہت مشکل ہے ہم کو یار کے گھر کا

مری قسمت میں مے واعظ کی قسمت میں ہے ناکامی
میں پینے والا ہر شب کا وہ طالب جامِ کوثر کا

ترے جوشِ تصور کا میں قائل ہو گیا اے دل
شبِ غم میں بھی نقشہ کھنچ گیا زلفِ معنبر کا

اگر تقدیر الٹی ہو تو کیا تدبیر سے ہوگا
وہی ہوتا ہے دنیا میں جو لکھا ہے مقدر کا

کوئی محوِ خرامِ ناز ہے اب دیکھیے کیا ہو
قیامت خیز منظر ہے ادائے فتنہ پرور کا

وفا سے آشنا ہی جب نہیں پھر دوستی کیسی
محبت کیا کرو گے تم تمہارا دل ہے پتھر کا

حیاتِ چند روزہ پر نہ اترا اس قدر ناداں
حباب آسا ہے وقفہ عالمِ ہستی میں دم بھر کا

ہجومِ غم کا عالم دیکھ کر وہ مسکراتے ہیں
اثر اتنا ہی ہوتا ہے ہمارے دیدۂ تر کا

جب اے اوتار ہر و ماہ بھی چکر میں رہتے ہیں
گلا کرتا ہے تو کیوں گردشِ چرخِ ستمگر کا

١٦
وہ سراپا ناز شامِ انتظار آ ہی گیا
چین تجھ کو اے دلِ امیدوار آ ہی گیا
میکدہ میں واعظِ تقویٰ شعار آ ہی گیا
کھنچ کے سرشاروں میں آخر ہوشیار آ ہی گیا
وعدۂ وصلِ صنم اک مژدہ آیا نامہ بر
کون کہتا ہے کہ ہم کو اعتبار آ ہی گیا
تھی نہ امیدِ وفا اس شاہدِ مغرور سے
بیکسوں کے کام عجز و انکسار آ ہی گیا
موت سے مشکل نہ اے عاشق کی آساں ہو گئی
زیرِ تربت اب اسے صبر و قرار آ ہی گیا
ہم وفاداروں سے ان کو اور نفرت ہو گئی
غیر کی باتوں کا آخر اعتبار آ ہی گیا
عشقِ خوباں در حقیقت اک عبادت ہو گئی
یاد ان کو دیکھ کر پروردگار آ ہی گیا
ہجر میں اوتارِ خستہ جاں کی حالت غیر تھی
دیکھ کر رونا ہمیں بے اختیار آ ہی گیا

١٧
سمجھ لے دل کہ محبت کا کچھ صلہ نہ ملا
جو قتل گہ میں بھی وہ خنجر آزما نہ ملا
تمام عمر ہوئی صرف جستجو میں مگر
ہزار حیف کہ اس کا کہیں پتا نہ ملا

میں کس زباں سے کہوں تم کو ساقیِ محفل
کہ جام ایک بھی لبریزِ مدعا نہ ملا

عیاں ہے طور کا جلوہ ہر ایک ذرہ سے
خدا خدا کرو یہ کہتے ہو گیا خدا نہ ملا

ہمیں تو تم کو شکایت ہمیں سے رنجش ہے
ہمیں بُرے ہیں کوئی دوسرا بُرا نہ ملا

نہ پائی خوئے وفا ان بتوں میں ہم نے کبھی
صنم کدہ میں کوئی دردآشنا نہ ملا

بتوں کے کوچے میں دیکھ آئے ہم بھی اے اوتار
کہیں بھی تیرا دلِ زار و مبتلا نہ ملا

۱۸
جوشِ گل میں وہ مرا چاکِ گریباں ہونا
یاد اب تک ہے مجھے گھر کا بیاباں ہونا

تیرگیِ شبِ غم میں مجھے یاد آتا ہے
ہائے اس زلفِ پریشاں کا پریشاں ہونا

ایک توبہ سے درِ رحمتِ حق کھلتا ہے
کافروں کے لئے آساں ہے مسلماں ہونا

ہمت اے جوشِ وفا المدد اے نالۂ دل
کوئی مشکل نہیں مشکل کا بھی آساں ہونا

ذرہ ذرہ میں تھا ہنگامۂ وحشت برپا
جوشِ گل سے دلِ بیخود کا وہ حیراں ہونا

کس طرح بنتا درِ اشکِ محبت پھر وہ
جس کی تقدیر میں تھا گوہرِ تاباں ہونا

یاد آتا ہے اب اوتار ہمیں تیرے بعد
بزمِ احباب میں وہ تیرا غزلخواں ہونا

۱۹
دنیائے عشق میں وہ گنہگار ہو گیا
دل دے کے پھر جو طالبِ دیدار ہو گیا

جب بے نقاب عارضِ دلدار ہو گیا
ہر اک شرابِ دید سے سرشار ہو گیا

جینے سے کوئی عشق میں بیزار ہو گیا
مرنا بھی اس کے واسطے دشوار ہو گیا

کس کو رقیب جانوں میں کس کا گلہ کروں　　ہر اہلِ دل تمہارا طلب گار ہو گیا

اوتار اس جہان میں وہ بدنصیب ہوں
جس گل کو میں نے دیکھا وہی خار ہو گیا

تو تصور میں بار بار آیا　۲۰　خوب ہی لطفِ انتظار آیا ۱۹۱۶ء
باغ میں موسمِ بہار آیا　　جس کا سب کو تھا انتظار آیا
دیکھ تو وقت نزع بالیں پر　　کون اے چشمِ انتظار آیا
شبِ وعدہ ہماری قسمت میں　　اک ستمگر کا انتظار آیا

مجھ کو اوتار چین کیوں کر آئے
شب ہوئی وقتِ انتظار آیا

عدم میں چین سے تھا کیوں ہوا تو اے بشر پیدا ۲۱ ۱۹۱۵ء
بتوں کو اپنا دل دے کر کیا ہے دردِ سر پیدا
نہ آفت جان پر آتی نہ ہوتا دردِ سر پیدا
خدایا اس سے بہتر تھا نہ ہوتے ہم اگر پیدا
نہ ہو سوزِ جگر تو لذتِ عشقِ بتاں کیوں ہو
اگر سودائے الفت ہے تو کر دردِ جگر پیدا
چلا آتا جگر تھامے ہوئے وہ محو خود بینی
شبِ غم کاش ہوتا جذبۂ دل میں اثر پیدا

چمکتے ہیں ستاروں کی طرح وہ چرخِ رفعت پر
گئے تھے دیدۂ تر نے مرے جتنے گہر پیدا

ستایا ہے فلک نے ہم کو یارب یہ بھی جل جائے
ہماری آہ میں اتنا تو ہو جائے اثر پیدا

مذاقِ نغمہ ہے تجھ کو تو لطفِ گوش پیدا کر
"اگر شوقِ تماشا ہے تو کر ذوقِ نظر پیدا"

غنیمت بزمِ عالم میں ہے اے اوتار دم تیرا
نہیں ہر روز ہوتے دہر میں اہلِ ہنر پیدا

۱۹۱۲ء

٢٢
بے نقاب آج جو وہ نیرِ تاباں نکلا — شرم سے مہرِ فلک سر بگریباں نکلا
تیری محفل سے کوئی با دلِ نالاں نکلا — شمعِ کشتہ کا دھواں بن کے پریشاں نکلا
حسنِ زیبا کو چھپانا ہے خلافِ فطرت — چرخ پر ماہ کو بھی دیکھ لو عریاں نکلا
الفتِ گل میں ہوئے ہم تو اسیرِ گلشن — جس کو سمجھے تھے نشیمن وہی زنداں نکلا
جس کو خورشیدِ جہانتاب سمجھتے تھے سب — غور سے دیکھا تو داغِ دلِ سوزاں نکلا
لاکھ مشاطہ نے کوشش پئے آرائش کی — ایک بھی خم نہ ترا گیسوئے پیچاں نکلا

عمر بھر میں رہا ناکامِ تمنا اوتار
آرزو نکلی نہ کوئی مرا ارماں نکلا

٢٣
دل میں ہے عشق اک بتِ گلفام کا — لب پہ شکوہ گردشِ ایام کا

ذکر فرقت میں کہاں آرام کا — حشر یہ ہے عاشقِ ناکام کا

دوست اچھوں کا ہے اک عالم مگر — کوئی دنیا میں نہیں بدنام کا

ہو ادھر بھی ساقیا چشمِ کرم — مدّتوں سے منتظر ہوں جام کا

مدّتیں گذریں ستاتی ہے خودی — ذکر بے حاصل ہوا اس گمنام کا

خوش ہوں قاصد کچھ خبر لایا نہیں — گوش منّت کش نہیں پیغام کا

پھر شبِ غم کا ہے اے دل سامنا — دن ڈھلا پھر وقت آیا شام کا

کچھ پتہ آغاز کا چلتا نہیں — سوچنا بے سود ہے انجام کا

مسلم و ہندو میں جھگڑا ہی چھٹ — نام اک رحمان بھی ہے رام کا

سنتے ہیں اوتار عاشق ہو گیا
اک پری چہرہ بتِ گلفام کا

نہیں ہے شکوہ مجھے تیری کج ادائی کا — گلہ اگر ہے تو ہے دل کی بیوفائی کا

نہیں قلق مجھے اس بت کی بیوفائی کا — گلہ زباں پہ ہے قسمت کی نارسائی کا

ادھر بھی اک نگہِ مست ساقیِ رعنا — جنابِ شیخ کو دعویٰ ہے پارسائی کا

قصور اہلِ نظر ہے اگر نہ دیکھ سکیں — ہر ایک ذرہ میں نظارہ ہے خدائی کا

سنا ہے تیغ بکف آئیں گے وہ مقتل میں — ادا حق آج کریں گے ہم آشنائی کا

برا برا ہے مجھے کہہ کر وہ ہو گئے رسوا — نتیجہ نیک نکلتا نہیں برائی کا

ہمارے عشق پہ اب ان کو اعتماد نہیں — صلہ یہ خوب ملا صبر آزمائی کا

بگڑ کے پوچھتے ہیں وہ اپنے دربان سے — کہ سنگ در پہ نشاں کیوں ہے جبہہ سائی کا

وہ راہ و رسم مروت ہوئی اب تو خواب و خیال
زمانہ اُٹھ گیا اوتار ہر بھلائی کا

۲۵

ساقی کی بزم میں وہی ہشیار ہو گیا — دو چار گھونٹ پی کے جو سرشار ہو گیا
جب گرم حسن و عشق کا بازار ہو گیا — مطلوب کوئی کوئی طلبگار ہو گیا
عاصیِ شرمسار کا ہر اشک چشم تر — اختر فلک پہ بن کے نمودار ہو گیا
میں عمر بھر تو دیکھا کیا خوابِ زندگی — آیا پیام مرگ تو بیدار ہو گیا
صیاد کا دماغ جو آج آسماں پہ ہے — پھر کوئی غم نصیب گرفتار ہو گیا
جس کی طرف اٹھی نہ تری چشم التفات — رخصت جہاں سے آج وہ بیمار ہو گیا
کس کو سناؤں جا کے میں اب داستانِ غم — میرا رقیب ہی مرا غمخوار ہو گیا
جس کی طلب ہے شیخ تہجد گزار کو — جب ہم نے سر جھکا لیا دیدار ہو گیا

رکتا نہیں ہے نالۂ بے اختیار کیوں
کیا آپ کو یہ حضرت اوتار ہو گیا

۲۶

ہوش سے نا آشنا ہو جب سے سودا ہو گیا
کہتے ہیں اوتار کو پریوں کا سایہ ہو گیا

شکوہ کر کے اس بھری محفل میں رسوا ہو گیا
اے دلِ بے صبر آخر تجھ کو یہ کیا ہو گیا

اک ستمگر پہ دلِ نافہم شیدا ہو گیا
جس کو سمجھا تھا میں اپنا وہ پرایا ہو گیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ان کو دیکھ کر ہو گا سکوں
آشنا ہو کر دوا سے درد دونا ہو گیا

سرگذشتِ اضطرابِ دل پہ ہنستا ہو کوئی
شکوۂ جور و جفا گویا تماشا ہو گیا

گریۂ پیہم سے رازِ کاوشِ پنہاں کھلا
اے دلِ نافہم کوئی تجھ سے رسوا ہو گیا

ڈھونڈتے ہو کیا مرے پہلو میں اب رکھا ہی کیا
ایک دل تھا وہ بھی تو صرف تمنّا ہو گیا

کوئی آتا ہے سرِ بالیں عیادت کے لئے
یہ خبر سن کر دلِ بیمار اچھا ہو گیا

چونکتے ہنگامۂ محشر سے کیا پامالِ عشق
تیرے پاؤں کی مگر آہٹ کا دھوکا ہو گیا

خود فراموشی سے دنیا میں ہے تحصیلِ کمال
بلبلا جو مٹ گیا وہ آبِ دریا ہو گیا

ایک دنیا بے خبر تھی میرے دردِ عشق سے

اس غزلخوانی سے میرا راز افشا ہو گیا

نکلے ہیں کیا کیا مضامینِ وسیع اس بحر میں
آج تو کوزے میں گویا بند دریا ہو گیا

کیوں نہ ہو اوتار مجھ کو ناز تیری نظم پر
آج تو بزمِ سخن میں بول بالا ہو گیا

ہم سے کچھ بھی تو اے خدا نہ ہوا ۲۷ تیری رحمت کا حق ادا نہ ہوا ع ۹ ۔ ۷
درد سے دل جو آشنا نہ ہوا ایک مورت ہے وہ ہوا نہ ہوا
ان کے لب پر نہیں کے تھے آثار یہ لبِ التجا بھی وا نہ ہوا
جب سے عاشق ہوا ہوں میں تجھ پر دشمنِ جان و دل زمانہ ہوا
تپِ غم سے تھا جاں بلب کوئی موت کے آنے کا بہانہ ہوا
قیدِ غم سے تھی عندلیب آزاد جب قفس اس کو آشیانہ ہوا

تیغ کھینچے وہ آتے ہیں اوتار
اجل آنے کا کچھ بہانہ ہوا

دکھلا کوئی کرشمہ اس طبعِ سحر فن کا ۲۸ عالم فریفتہ ہو رعنائی سخن کا ع ۹ ۔ ۸
غربت کی بیکسی میں شیدا ہوں یوں وطن کا مرغِ اسیر جیسے دلدادہ ہو چمن کا
فصلِ بہار آئی ہیں مستِ ناز گل رو موسم دوبارہ آیا شادابیٔ چمن کا
گل مسکرا رہے ہیں کلیاں چٹک رہی ہیں "شاداب غنچہ غنچہ ہو ہر کے چمن کا"

تشبیہِ برق دینا ہے عاجزی بیاں کی
عالم بدل گیا ہے اِس قلبِ پُر محن کا

اوتار کیا بتاؤں حالت ہوئی جو دل کی
شیدا ہوا ہوں جب سے اصنامِ گلبدن کا

(۱۹ء)

اک وہ ظالم ہے کہ سرتاپا جفا پیدا ہوا ۲۹
اک مجھے دیکھو کہ مانوسِ وفا پیدا ہوا

ہیں اٹھانے کے لئے جور و جفا پیدا ہوا
دلربائی کے لئے وہ دلربا پیدا ہوا

ہم نے یہ مانا کہ وہ بُت بیوفا پیدا ہوا
اے دلِ مجبور تو ضبط آشنا پیدا ہوا

ہی فقط جوشِ تمنا پر مدارِ زندگی
بند پانی میں ہوا سے بلبلا پیدا ہوا

بیکسی نے میری کھلائی ہے وہ تاثیر اب
اسکے سینے میں بھی دلِ درد آشنا پیدا ہوا

یاد آئی جب مجھے تیری دلِ الفت پرست
پہلو خالی میں میرے درد سا پیدا ہوا

کچھ نہیں اوتار گو معنی ترے اشعار میں
خوبیٔ الفاظ سے لیکن مزا پیدا ہوا

(۱۹ء)

کعبہ سے ان بتوں کی کافرادا نے روکا ۳۰
جب تکیے میں پہنچے خوفِ خدا نے روکا

تیری ستم گری کا انجام تو یہی تھا
ہم ترکِ عشق کرتے لیکن وفا نے روکا

بے سود چارہ گر ہیں یہ چارہ جوئیاں سب
کوئی اجل سے کس کو فکرِ شفا نے روکا

واعظ میں جانتا ہوں خود راہِ پارسائی
لیکن مجھے بتوں کی کافرادا نے روکا

اوتار وصلِ دلبر ہو بھی تو کس طرح ہو
پاسِ ادب تھا مانع اس کی حیا نے روکا

۳۱

سامنا کب کر سکا کوئی کسی جلاد کا — کیا کروں شکوہ بتوں کے شیوۂ بیداد کا

حد سے گذرا ہے ستم اس بانیٔ بیداد کا — کیا اسیری میں کرے شکوہ کوئی صیاد کا

ظلم ناحق سہہ رہا ہوں اس ستم ایجاد کا — رقصِ بسمل مشغلہ ہے فتنہ گر جلاد کا

کیوں نہ الجھے آ کے سر اک طائرِ مجبورِ عشق — دامِ الفت الجھ گیا ہر موئے سر سے صیاد کا

باندھ کر سر سے کفن مقتل کو وہ جاتا ہے آج — حشر کیا ہوتا ہے دیکھیں عاشقِ ناشاد کا

یہ تو میں سمجھا ہوا ہوں کچھ نہیں اس میں اثر — کیوں ہو دل مرہونِ منت لب پہ فریاد کا

کہتے ہو استاد فنِ شاعری میں فرد ہے
جانتے بھی ہو کہ ہے شاگرد کس استاد کا

۳۲

نہ جانے اور کتنی بار وہ بت بدگماں ہوگا
سنا ہے آج مقتل میں پھر اپنا امتحاں ہوگا

عجب پُر کیف و لطف اندوزائے دل وہ سماں ہوگا
شبِ وعدہ مرے پہلو میں جب آرامِ جاں ہوگا

پھریں گے میرے کب دن دوست کب یہ آسماں ہوگا
تری رحمت کا ہوں میں ملتجی کب مہرباں ہوگا

وہی بندہ حقیقت میں عزیزِ دو جہاں ہوگا
جو یارِ بے کساں ہوگا عصائے ناتواں ہوگا

تمنا ہے یہ جوشِ سجدۂ اہلِ عقیدت کی

سرافرازِ جبیں کب ان کا سنگِ آستاں ہوگا

ابھی کم سن ہے وہ بت اک زمانہ جس کا شیدا ہے
نہ جانے کیا ستم ڈھائیگا جب وہ نوجواں ہوگا

نہیں ہیں دور اب وہ دن ہمارے جوشِ وحشت سے
جہاں ہم بیٹھ جائینگے وہ مسکن بے نشاں ہوگا

نہ بھڑکا آتشِ خاموش کو تو اے فلک ورنہ
مثالِ برق میرا داغِ دل شعلہ فشاں ہوگا

کشش ہے کچھ اگر جذبِ محبت میں تو وہ ظالم
کہیں بھی ہو مگر آئینۂ دل میں عیاں ہوگا

وہ کب آئینگے دن جب قید سے ہم چھوٹ جائینگے
مزے لوٹیں گے گلشن کے وہیں پھر آشیاں ہوگا

سنائے گا کسے غربت میں اے اوتار شعر اپنے
نہ کوئی ہم سخن ہوگا نہ کوئی ہمزباں ہوگا

۲۳

سراپا یاس تھا مجبور رہا حالِ خراب آیا
ترے کوچے سے جب واپس دلِ پُراضطراب آیا

کسی دن کھول کر بھی وہ اگر بندِ نقاب آیا
تو برقع کی جگہ رخسارِ نازک پر حجاب آیا

مٹے گی ظلمتِ شبہائے غم پر نور گھر ہوگا
اگر میرے مقدر سے وہ رشکِ آفتاب آیا

کریں گے یاد کیا ہم میکدے کو تیرے اے ساقی
کسی دن بھی ہمارے سامنے جامِ شراب آیا

ہمارے قتل کرنے میں تجھے کس بات کا ڈر ہے
مکر جائیں گے سچ کہتے ہیں جب روزِ حساب آیا

۴۴

بادہ نہ ہو فضول ہی ہونا ایاغ کا | بے سود ہے جو جوش ہو ہونا دماغ کا
ہونا عیاں قمر کا مقابل میں یار کے | سورج کے سامنے ہے دکھانا چراغ کا
وہ گم شدہ ہوں میں نہیں اپنی خبر مجھے | عنقا ازل سے نام ہے میرے سراغ کا
قائل ہوں تیرے جوشِ تصور کا عندلیب | نقشہ جما لیا ہے قفس میں بھی باغ کا

سینہ میں دل نہیں مگر اس کا نشاں تو ہے
احسانمند کیوں نہ ہوں میں دل کے داغ کا

۴۵

دلِ ناداں غم آشنا ہونا | مفت میں اپنی جان ہے کھونا
نظر آئے وہ خواب میں شاید | شبِ غم ہو نصیب اگر سونا
ہے امید کرم جو سیکھا ہو | چشمِ گریاں نے داغِ دل دھونا
دردِ دل ہے سناؤں کس کس کو | ہے عبث عشق میں مرد دنا
اشک شوئی کو وہ نہیں آئے | زندگی بھر رہا یہی رونا
ہم میں خامشی اگر تو حکمت سے | بات کرنا ہے آبرو کھونا

اب نوا و تارِ گور میں سو جا
عافیت کا یہی ہے اک کونا

غزل

۲۶
غمِ فرقت میں رونا جان سے بیزار ہو جانا
محبت کیا ہے شیدائے بتِ عیار ہو جانا

کسی کے ابروئے خمدار کا تلوار ہو جانا
ہمارے زخمہائے دل کا ہے گلزار ہو جانا

حسینوں کا یہی شیوہ ہے فیشن ہے طریقہ ہے
کسی سے دشمنی کرنا کسی سے پیار ہو جانا

الٹ کر اب نقابِ رخ کوئی محفل میں آتا ہے
نگاہِ شوق سے کہہ دو ذرا ہوشیار ہو جانا

نہ بھولے گی مقدر کی یہ ناکامی نہ بھولے گی
ریاضِ دہر کا میرے لئے پرخار ہو جانا

خمارِ بادۂ رنگیں کو میں تو زیست کہتا ہوں
اجل ہے بزمِ ساقی میں مرا ہشیار ہو جانا

عیادت کو وہ آئے ہیں مرے گھر پر زہے قسمت
مبارک ہو گیا مجھ کو مرا بیمار ہو جانا

بکھرنا گیسوئے پر پیچ و خم کا تیرے شانوں پر

اسی کو لوگ کہتے ہیں گلے کا ہار ہو جانا

ہمیں اس عالمِ پیری میں بھی تو یاد آتا ہے
ترا شیدا ہر اک مہ رو پر اے اوتار ہو جانا

یقین آئیگا کس کو اور کون اوتار مانے گا
تمھارا عالمِ پیری میں نیک اطوار ہو جانا

کوئی قسمت بدل نہیں سکتا ۳۷ جو لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا ۱۹۲۸ء
دل اگر ہو تو نرم ہو جائے سنگ لیکن پگھل نہیں سکتا
راہ پُر خار دور تر منزل آبلہ پا ہوں چل نہیں سکتا
جس نے کاٹی ہوں ہجر کی راتیں حشر سے وہ دہل نہیں سکتا
جس جگہ ہو نہ ذکرِ حسنِ بتاں دل ہمارا بہل نہیں سکتا

ہائے اوتار کا دلِ مضطر
اب سنبھالے سنبھل نہیں سکتا

اگر آ جائے گریباں کو گریباں ہونا ۳۸ کوئی مشکل نہیں مشکل کا پھر آساں ہونا ۱۹۳۴ء
کہا جاتا نہیں افسانۂ ناکامیٔ دل اک قیامت ہے ترا سر بگریباں ہونا
صورتِ ماہیٔ بے آب دلِ مضطر کا کاوشِ غم میں وہ گھبرا کے پریشاں ہونا
وہ تری زلفِ سیہ فام کا کھلنا رُخ پر پھر وہ ابر میں مہتاب کا پنہاں ہونا
نغمۂ بلبلِ شوریدہ ہے دراصل اوتار بزمِ احباب میں یوں تیرا غزلخواں ہونا

۳۹

[illegible] کبھی دل میں آئی تو آ گیا۔ سرِ بزم طعنے سنا گیا
قلق اور دل کا بڑھا گیا۔ رہو وقفِ الم یہ جتا گیا

کی اگرچہ کتنی ہی جستجو رہے دربدر پھرے کو بکو
نہ ملا کبھی بتِ حیلہ جو وہ جو ہم سے آنکھ لڑا گیا

یہ گلہ ہے عاشقِ زار کو یہی غم ہے خستہ و خوار کو
نہیں قدر کچھ میری یار کو۔ ابھی گھر سے ہو کے خفا گیا

[illegible] برقِ سوزاں نے مجھے خوب جلایا ہوتا ۴۰ دلِ مہجور کے شعلوں کو بجھایا ہوتا
بیکسی روتی ہے کیوں آج مری بالیں پر کسی بیدرد ستمگر کو رلایا ہوتا
کس لئے روتی ہے اب فرقتِ گل میں بلبل پہلے کچھ سوچ کے دل ہی نہ لگایا ہوتا
تو نے اے برق جلایا ہے جو کاشانۂ دل
کچھ تجھے رحم بھی اے وقتا رہے آیا ہوتا

[illegible] ہر قالب اس جہان میں ناشاد ہی رہا ۴۱ رنج و غمِ فراق سے برباد ہی رہا
صد حیف آرزوئے رہائی میں مرغِ دل آخر اسیرِ پنجۂ صیاد ہی رہا
اک میں کہ بار بار پھنسا دامِ زلف میں اک وہ کہ دل اڑا کے بھی آزاد ہی رہا
صد ہا دلِ حزیں کی تمنائیں مٹ گئیں اے ہم نفس یہ گھر مرا برباد ہی رہا
مطلب کی بات کہنے نہ پائے وہ چل دیئے
بے کار اپنا دفترِ فریاد ہی رہا

۱۹۰۶ء ہو صاف مثلِ آئینہ دل اپنے یار کا ۴۲ اٹھ جائے جلد کاش یہ پردہ غبار کا
کر لو مزے کہ پیری بھی آئیگی جلد تر عالم شباب کا بھی ہے موسم بہار کا
ان کو ہوئی نوید مری مرگِ بیکسی بولے کہ قصہ مٹ گیا اب بار بار کا

گلشن میں نم اداس ہوا قمار کیلئے
خنداں ہیں پھول آگیا موسم بہار کا

۱۹۰۷ء اس نے محفل میں جدھر بھی روئے زیبا کر دیا
محوِ حیرت کر کے ہر اک کو تماشا کر دیا

حُسن تھا پردہ نشیں اب تک حریمِ ناز میں
انتہائے شوق نے اس کو بھی رسوا کر دیا

چار سو شہرت ہوئی تیری مگر کس کے طفیل
جس جنونِ عشق نے مجھکو تماشا کر دیا

خود بخود بے پردہ چل کر آیا وہ پردہ نشیں
میری تاثیرِ محبت نے بھی کیا کیا کر دیا

چارہ گر جس درد کا تجھ سے نہ ہوتا تھا علاج
موت نے آکر اسے دم بھر میں اچھا کر دیا

کیوں فراہم کر دیئے جذبات حسن و عشق کے
کیوں مری دنیائے دل میں حشر برپا کر دیا

وہ محبت ہی تو ہے جس نے وفورِ شوق میں
میرے ہر ہر اشک کو آنکھوں کا تارا کر دیا

ابتدا و انتہا ہیں ایک حسن و عشق کی
اے مذاقِ خام تو نے فرق پیدا کر دیا

خون کے دو قطروں سے بڑھ کر تھا نہ جس دل کا وجود
اس نے سینے میں مچل کر حشر برپا کر دیا

باعثِ رنجش ہی کیا۔ کیوں ہو گئے ہو تم خفا
ترک کیوں اوتارؔ کے گھر آنا جانا کر دیا

دن نیا۔ ماہ نیا۔ سال نیا۔ ساز نیا
آج اوتارؔ غزل کا بھی ہو انداز نیا

طائرِ فکرِ رسا میرا ہے عنقا طالب
اُگ رہا اُس کا ہی پھر سے پرِ پرواز نیا

دفعِ ہستی ہے مری ناز اٹھانے کے لئے
کیوں نہ ہر روز ہو تازہ بتِ طنّاز نیا

شمع سا جلتا ہوں میں بھی سرِ محفل ہر شب
اور بھی جلنے لگا کوئی اعزاز نیا

ہم نے دیکھے ہیں بہت ناز و نزاکت والے

اس پری وش کے ہے ہر ناز کا انداز نیا
ملتیں کاٹ کے تعصب کے سلاسل توڑے
ہند میں پیدا ہوا ایسا کوئی جاں باز نیا
تفرقہ ہندو و مسلم کا ہوا انجام پذیر
گاندھی و جناح میں الفت کا ہوا آغاز نیا
روز افزوں ہے ترا حسنِ تخیل اوتار
ہر نئے شعر میں شوخی نئی۔ اعجاز نیا

۴۵
کیوں گلہ کرتا ہے اے اوتارؔ تو تقدیر کا
ہے شکستہ جبکہ ہر ناخن تری تدبیر کا
کچھ اثر مطلق نہیں ہے نالۂ شبگیر کا
نام عنقا ہے ہماری آہ کی تاثیر کا
اتنی بیتابی سے حاصل۔ اس قدر عجلت ہے کیوں
ٹل رہیگا جو بھی لکھا ہے تری تقدیر کا
یا الٰہی کیا دیا تو نے مجھے پہلو میں دل
قطرۂ خوں ہے کہ ٹکڑا ہے برقِ آتش گیر کا
آستانِ یار پر مٹ جائے ہر نقشِ جبیں
حوصلہ تھوڑا سا بڑھ جائے اگر تدبیر کا
زلفِ پُر خم کے جو سودا کا یہی عالم رہا
پھر جنوں توڑیگا ہر حلقہ مری زنجیر کا
روبروئے یار پہنچا ہی دیا اوتار کو
حوصلہ دیکھو تو کتنا تھا مری تقصیر کا
تیری بیتابی سے اے دل دیکھ کیا کیا ہو گیا
تو بھی رسوا ہو گیا اور میں بھی رسوا ہو گیا

ہم وہی - دل بھی وہی ہے - اور وہی ارض و سما
کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ پھر کیا ہو گیا

چل دیا دارِ فنا کو چھوڑ کر یہ غم کدہ
تیرا بیمارِ محبت آج اچھا ہو گیا

یہ مسلّم ہے مقامِ دید ہیں دیر و حرم
اس کی قسمت جو یہاں محوِ تماشا ہو گیا

چھا گئی ہر ہر ادائے حُسن پھر رخسار پر
اس نے جب پردہ اٹھایا اور پردہ ہو گیا

تو نے جب تلوار اٹھائی - جُھک گیا عاشق کا سر
رُخ ترا فرطِ غضب میں اور پیارا ہو گیا

کس کو لاؤں ڈھونڈھ کر تیری تمنا کیلئے
ایک دل تھا پہلے ہی صرفِ تماشا ہو گیا

دل میں پیدا ہو گئے کیا کیا خیالاتِ عجیب
یہ گہر ہائے معانی کا خزانا ہو گیا

جانتا تھا تم کو اے اوتار کون اس دور میں
شعر کہنے سے تمہارا نام پیدا ہو گیا

اگر دل ہے تو ہو جائیگا کوئی دلستاں پیدا

اگر سر ہے تو ہو جائے گا سنگِ آستاں پیدا

الٰہی اب تو ہم ضبطِ فغاں بھی کر نہیں سکتے
ہماری خامشی سے ہے انھیں کیا کیا گماں پیدا

وہ کہتے ہیں کہ آئیں گے تمھارے گھر مگر اس دن
نئے شمس و قمر ہوں جب نیا ہو آسماں پیدا

فغانِ عندلیبِ زار سنکر دل پکار اٹھا
ہوا اک رازداں پیدا ہوا اک ہم زباں پیدا

فغاں بے سود، نالہ بے اثر، فریاد بے حاصل
جو ہے تاثیر کی خواہش تو کر جوشِ بیاں پیدا

نیا درسِ محبت بھی پلا کر بادۂ عرفاں
نہ ہوگا حضرتِ دل سا بھی کوئی مہرباں پیدا

کرشمہ دیکھا اے افگار تو جوشِ تصور کا
قفس کی تیلیوں سے ہو گیا پھر آشیاں پیدا

غزل

عیش و عشرت کا مہیا کوئی ساماں نہ ہوا ‌ راحتِ دل کبھی وہ دشمنِ ایماں نہ ہوا
پار سینے کے ترا ناوکِ مژگاں نہ ہوا ‌ کاوشِ دل تو ہوا۔ درد کا درماں نہ ہوا
اے مایوسِ تمنا کا سکونِ خاطر ‌ مدتیں گذریں۔ کبھی چاکِ گریباں نہ ہوا
شدتِ غم نے مجھے ختم کیا شامِ الم ‌ اے اجل میں ترا شرمندۂ احساں ہوا

بھولتے کیوں ہو عمر بھر کی قسم کھائی تھی
ایک فقرہ ہوا یہ وصل کا پیمان ہوا

بتکدہ مجھ سے نہ چھوٹا نہ یہ مسجد سے ٹلے
شیخ کافر نہ ہوئے میں بھی مسلمان ہوا

خودنمائی تو ہے کم ظرفوں کی فطرت یعنی
کیوں اسے چاند سمجھیے جو نمایاں ہوا

کونسی تیری نظر دشمنِ ایماں نہ بنی
کونسا فتنہ تھا جو شر بداماں نہ ہوا

الجھنیں پڑ گئیں کوتاہیٔ قسمت کے سبب
کام آساں بھی ہمارے لیے آساں ہوا

شوقِ دیدار کی بیتابیاں اللہ اللہ
پردہ اٹھنے پہ بھی نظارۂ جاناں نہ ہوا

مسکراہٹ کبھی آئی نہ لبوں پر تیرے
ناشگفتہ رہا غنچہ۔ گلِ خنداں نہ ہوا

سن کے نالے مرے ہے اہلِ نظر کا جمگھٹ
اک تماشا ہوا۔ جوشِ غمِ ہجراں ہوا

منتشر نکہتِ گل۔ کاکلِ مشکیں خم دار
نالۂ دل کی طرح کوئی پریشاں ہوا

روزمرہ کی زباں ہیں جسے دل کہتے ہیں
درحقیقت ہے وہ شعلہ کہ جو عریاں ہوا

شاعری کیلئے حاجت ہے زباں دانی کی
وہ سخن فہم ہی کیا ہے جو زباں داں نہ ہوا

حسرتیں دل کی رہیں دل میں مرے اے اوتار
ہائے افسوس کہ پورا کوئی ارماں نہ ہوا

۴۹
تیرا شیدائی مسلماں ہو گیا
عشقِ خوباں جزوِ ایماں ہو گیا

دل کے داغوں میں ہے اک داغِ کہن
آسماں پر ماہِ تاباں ہو گیا

ضبط سے فق ہو گیا چہرے کا رنگ
جب چھپایا راز افشاں ہو گیا

الفتِ گل میں تجھے اے عندلیب
صحنِ گلشن جیسے زنداں ہو گیا

آ گئی پھر اس کی رحمت جوش پہ — میں سرِ محشر پشیماں ہو گیا
مر گیا بیمارِ غم اچھا ہوا — دردِ دل کا آج درماں ہو گیا

موسمِ گل آ گیا اوتار پھر
چاک پھر اپنا گریباں ہو گیا

موڑ کر مونھ کو کوئی شرما گیا ۵۰ جلتے جاتے کیا قیامت ڈھا گیا
دل نہیں تھا. یوں تو کچھ بھی نہیں — جس نے دل جیتا وہ سب کچھ پا گیا
اس قدر ہوں سادہ اور خوش اعتقاد — ہر فریبِ دل مجھے بہلا گیا
یوں تو دنیا میں بہت کہنے کو ہیں — دوست وہ جو وقت پر کام آ گیا
کیا کہوں. کیوں. کس لئے. کس واسطے — دل کی مرضی جب کسی پر آ گیا

ہو گیا اوتار سے غمخوار میں
زندگی سے دل مرا اکتا گیا

ایک بے دل کے حوالے دل کیا ۵۱ حسن کو یوں عشق کا قائل کیا
یہ تو بتلاؤ کہ کیا حاصل کیا — کام مانا آپ نے مشکل کیا
حال ماضی پر بنا ہے. حال کو — قائم اپنا آپ مستقبل کیا
اللہ اللہ حسنِ دلکش دل فریب — جس نے پیدا عاشقِ کامل کیا
کچھ نہ تھا جز جلوۂ حسنِ ازل — پردہ نابینائی نے حائل کیا
مے بری شئے ہے اگر اے شیخ جی — کیوں اسے جنت میں پھر داخل کیا

۵۲ (دسمبر ۱۹۲۹ء)

(بہار)

قالبِ پژمردہ کی امیدوں کو بر لائیں گے کب
بن سنور کر دیکھئے وہ میرے گھر آئیں گے کب

لے کے نقدِ دل چلے ہیں حُسن کے بازار میں
دیکھئے جنسِ محبت ہم وہاں پائیں گے کب

کمسنی کا دور ہے بیباکیاں ہیں حُسن میں
کب شباب آئے گا ہم سے آپ شرمائینگے کب

آئے گا او ستمگر کب تقدیر میں میری وہ دن
میں کہوں گا آئیے اور وہ یہ فرمائینگے کب

۵۳ (دسمبر ۱۹۲۹ء)

(ب)

کاش یوں جذبۂ دل کا ہو اثر آپ سے آپ
میرے ملنے کو وہ آئے مرے گھر آپ سے آپ

ہو گیا دل میں محبت کا اثر آپ سے آپ
لڑ گئی ایک ستمگر سے نظر آپ سے آپ

ہیں وہ مشتاقِ شہادت ہوں جو تو بھول بھی جائے
رکھدوں قدموں پہ تری کاٹ کے سر آپ سے آپ

کیا بلایا بھی کبھی تھا ہمیں اے دشمنِ جاں
بے حیا ہم نہیں آئیں ترے گھر آپ سے آپ

مجھ کو منظور نہیں چشم و زباں کی منت

ان پہ ظاہر ہے مرے غم کا اثر آپ سے آپ
کس نے اوتار کہا تھا تمہیں عاشق بن جاؤ
دل دیا۔ مول لیا دردِ جگر آپ سے آپ

۵۴ (ت)
میں عفو کا ہوں طالب امیدوارِ رحمت | شانِ کرم دکھائے پروردگارِ رحمت
نخلِ مراد کی پھر لائیں گی رنگ کلیاں | آئیگی جب چمن میں اپنے بہارِ رحمت
گلزارِ دہر میں ہوں وہ گل خزاں رسیدہ | جس پہ کبھی نہ برسا ابرِ بہارِ رحمت
شایانِ شانِ لطفِ ربِ کریم کب ہے | کیوں ہو حسابِ عصیاں کیسی ہے شمارِ رحمت
اوتار ہے پشیماں۔ نادم ہے۔ منفعل ہے
لیل و نہار اس کو ہے انتظارِ رحمت

۵۵
پھر کس لئے ہوں واعظ میں بدگمانِ رحمت | عاصی کے واسطے ہی مخصوص شانِ رحمت
عاصی پُرندامت ہوں پارسا نہیں میں | سر پر ہے سایہ افگن صد آسمانِ رحمت
یا رب ترے کرم کی لا انتہا ہے وسعت | کیوں کر ادا زباں سے ہوگا بیانِ رحمت
نادم تھا تیرا مجرم۔ رحمت کی جستجو تھی | ہر اشک ڈھونڈ لایا اک کاروانِ رحمت
ہے مرتکب گنہ کا اوتار یہ مسلّم
عاصی کو بخشنا ہے شایانِ شانِ رحمت

۵۶
جز وصل نہیں چارۂ بیمارِ محبت | یا رب یہ نہ ہو دشمن کو بھی آزارِ محبت
ایسا ہی ہمدم ہو مرے ذوقِ خلش کا | سینہ میں کھٹکتا ہی رہے خارِ محبت

کہتا ہے بصد ناز یہ دل بزمِ جہاں میں — وہ میں ہوں اٹھاتا جو رہا بارِ محبت
پھر بیچنے جاتے ہیں متاعِ دل و جاں ہم — پھر آج بڑھی رونقِ بازارِ محبت
پھر موسمِ گُل آگیا اوتار چمن میں
ہو قید سے آزاد گرفتارِ محبت

(۲۷-۶-۲۹) دل لگا بیٹھے ہیں اس سے ہم عبث (ث) آہ بے حاصل ہے جوشِ غم عبث
ان بتوں پر کچھ اثر ہوتا نہیں — خوں فشاں ہے دیدۂ پُرنم عبث
وقتِ زینت آج اُلجھے اور بھی — اس نے کھولے گیسوئے پُرخم عبث
شوق بے جرأت ہو دل بے حوصلہ — ربطِ حُسن و عشق ہے باہم عبث
گیسوؤں سے کی صبا نے چھیڑ چھاڑ
ہے کوئی اوتار سے برہم عبث

(۲۲-۶-۲۹) ہے میکشوں پہ رحمتِ پروردگار آج (ج) اٹھی گھٹا ہے برسے گا ابرِ بہار آج
ساقی پلا دے سب کو مے خوشگوار آج — رہ جائے تشنہ لب کوئی بادہ خوار آج
آہیں ہیں اور نالۂ بے اختیار آج — کیا ہو گیا ہے تجھ کو دلِ بے قرار آج
جس گل کو دیکھتا ہوں جگر اس کا چاک ہے — کس کے فراق میں ہیں سینہ فگار آج
نظارہ ہی محال تو کچھ لطفِ گوش ہو — قاصد یہی سنائے کہ آئیگا یار آج
افسوس تو یہی ہے کہ کل تک جو بس میں تھا — اس دل پہ ہم کو کچھ بھی نہیں اختیار آج
آئے گا کوئی پردہ نشیں قبر پر مری — بادِ صبا بجھا دے چراغِ مزار آج

خجلت سے تیرا ابر میں روپوش ہو گیا    دیکھے کوئی فروغِ دلِ داغدار آج

آہٹ پہ کان در پہ نظر ہے لگی ہوئی
اوتار کیوں کسی کا ہے کیا انتظار آج

(ج)

۵۹ لے گیا پہلو سے دل دلگیر کھینچ    اے جنوں اب حلقۂ زنجیر کھینچ

اس سے ملنے کا یہی انداز ہے    آہ کھینچ اور آہ کی تاثیر کھینچ

قتل میرا ہے اگر مدِ نظر    ابروئے خمدار کی شمشیر کھینچ

دامنِ تقدیر مل ہی جائے گا    بے تکلف دامنِ تدبیر کھینچ

ہے شبِ غم کس بلا کی تیرگی    اے تصورِ یار کی تصویر کھینچ

مجھکو اپنے جرم پر خود ناز ہے    روبروئے یار اے تقصیر کھینچ

تجھ سے اے اوتار کھنچتا ہے وہ بت
تو خدارا نالۂ شبگیر کھینچ

(د)

۶۰ کیا نبھائیگا کوئی طرزِ وفا میرے بعد    بھول جائیں گے یہ بت جور و جفا میرے بعد

کس کی قسمت میں ہے یہ مشقِ جفا میرے بعد    کون چاہیگا تجھے تو ہی بتا میرے بعد

قتل کرنا ہے تو کر لے بتِ بیدرد مجھے    تجھ سے سمجھیگا مگر میرا خدا میرے بعد

دمِ آخر ہے ہٹا اب تو نقابِ رخ کو    شیوۂ حسن ہے اندازِ حیا میرے بعد

بانیِ جور نہیں حسن رہے گا اوتار
کیا پلٹ جائیگی دنیا کی ہوا میرے بعد

بعدِ مدت کے جو دل بیٹھے ہیں مستانے چند[۶۱] ۱۹۶۱ء
آج ساقی انھیں پلوائیگا پیمانے چند

محفلِ حسن میں ہیں عشق کے دیوانے چند
شمع پہ آج فدا ہو گئے پروانے چند

چشم و دل جوش سے لبریز ہیں پر کیف ہے روح
ساقیِ عشق نے بخشے مجھے پیمانے چند

دیدۂ تر نے کئے خون کے دریا پیدا
خاک میری جو اڑی بن گئے ویرانے چند

بہ نگہِ غور سے کر میکدۂ دہر کی سیر
اس میں مدہوش بہت لوگ ہیں فرزانے چند

ناز جس پر ہو برہمن کو مسلماں ہوں وہ میں
کعبۂ دل کی مرے زیب ہیں بتخانے چند

حسنِ لیلیٰ ہے نہ وہ شورشِ عشقِ مجنوں
اگلے وقتوں کے فقط رہ گئے افسانے چند

سیرِ جنت میں نہیں عذر مجھے اے اوتار
پاس رکھ دے مرے لیکن کوئی پیمانے چند

ستانا جان کا زیبا نہیں جانِ جہاں ہو کر[۶۲] ۱۹۶۲ء

یہ بے مہری نہیں لازم ہے تم کو مہرباں ہو کر

شبِ غم ختم کی جب ہم نے مصروفِ فغاں ہو کر
کوئی وقتِ سحر بالیں پہ آیا نوحہ خواں ہو کر

نہیں ہوتے رسا نالے جو فرطِ ناتوانی سے
فلک پر کاش آہیں ہی پہنچ جائیں دھواں ہو کر

جوابِ خط سے تو بہتر تھا انکارِ جوابِ دل
عدو لایا ہے نامہ یار کا چٹھی رساں ہو کر

مٹائی ہم نے جب ہستیٔ دل پھر تجھ کو پایا ہے
نشاں اپنا کیا قائم جہاں میں بے نشاں ہو کر

دلِ بے چین تجھے یہ شوقِ دیدارِ صنم کیسا
کرے گا حوصلہ کیا آسماں تک ناتواں ہو کر

اٹھایا بزم سے جب اس نے تو اقرار یوں نکلا
نکالا چاہتے ہو گھر سے اپنے میہماں کر کر

۶۳
دل اچھلتا ہے ہمارا قہرِ دلبر دیکھ کر — ہنس رہے ہیں ہاتھ میں قاتل کے خنجر دیکھ کر
یہ وہی واعظ ہیں جو تھے میکدہ میں بادہ کش — کیوں ہنسی آئے نہ پھر بالائے منبر دیکھ کر
شب کو سوئے بام پر تو چاند نکلا ہی نہ تھا — اے فلک کس سو کا ہوا بیٹھے منور دیکھ کر
سامنا آہِ دلِ عشاق سے ممکن نہیں — اب تڑپنا دیکھ کر اے برقِ مضطر دیکھ کر

لغزشِ پا اک قیامت ہے دلِ غم آشنا
یہ صراطِ عشق ہے چلیئے سنبھل کر دیکھ کر

(۱۹۲۳ء) ہے زرد مہر تابِ رخِ یار دیکھ کر ۶۴ کیا کیا ہیں منفعل گلِ گلنار دیکھ کر
تشبیہ دے حسن خود بھی ہیں اوروں کو کیا کہوں آئینہ ہیں وہ پرتوِ رخسار دیکھ کر
پیشِ نظر ہے واقعہ طور و کلیم کا ڈرتا ہوں دل کو طالبِ دیدار دیکھ کر
اے دل سنبھل کے راہِ محبت میں رکھ قدم کہتا ہوں بار بار خبردار! دیکھ کر
وہ دن گئے کہ تھا تری خودداریوں پہ ناز اب رو رہا ہوں تجھ کو دلِ زار دیکھ کر
رسوا نہ کر مجھے دلِ ناکام عشق میں ہوں شرمسار تیری اطوار دیکھ کر
آوارگانِ عشق مصیبت پسند ہیں ہمت بڑھی ہے منزلِ دشوار دیکھ کر
اوتار حال کیا کہوں میں بزمِ ناز کا
جلتی ہے شمع گرمیِ گفتار دیکھ کر

(۱۹۲۲ء) جلتی ہے برق جلوۂ رخسار دیکھ کر ۶۵ لرزاں ہے تیغ ابروئے خمدار دیکھ کر
اختر خجل ہیں خالِ رخِ یار دیکھ کر شرما رہا ہے ماہ بھی رخسار دیکھ کر
عشقِ بتاں میں حالِ دلِ زار دیکھ کر روتے ہیں دوست ہنستے ہیں اغیار دیکھ کر
اللہ رے آرزوئے شہادت کہ اپنا سر جھکتا ہے خود بخود تری تلوار دیکھ کر
وا حسرتا کہ باغ میں گل سینہ چاک ہے احوالِ عندلیب گرفتار دیکھ کر
سکھلائیں آسمان نے یہ آہ و زاریاں مجھ کو ہجومِ یاس میں بیکار دیکھ کر

کیوں ان کے در کے سامنے میں نالہ کش ہوا — وہ پوچھتے ہیں کون ہے ہر بار دیکھ کر

کچھ چارہ گر کی چل نہ سکیں چارہ سازیاں — مایوس ہے وہ حالِ دلِ زار دیکھ کر

کس نے اسیرِ حلقۂ گیسو کیا مجھے — دل میں جنونِ عشق کے آثار دیکھ کر

محتاج مے کا ہوں تو کرو دل تیری منتیں — ساقی میں مست ہوں نگہِ یار دیکھ کر

پوچھا انھوں نے حالِ دلِ زار بھی کب — مفقود میری طاقتِ گفتار دیکھ کر

کیا دور ہے کہ بخشے مجھے رحمتِ خدا — ناچیز شرمسار گنہگار دیکھ کر

ہر اک ادا میں قدرتِ صانع کا ہے ظہور — سمجھا ہوں اس کو میں نگہِ یار دیکھ کر

آرام چاہتا ہے جو راہِ حیات میں — رکھ ہر قدم سنبھل کے خبردار دیکھ کر

عادی بہت ہے جور کا وہ خوگرِ ستم
دل مٹ چکے گا حسرتِ اوتار دیکھ کر

کھینچی ہے اس بتِ بے پیر کی تصویر کاغذ پر
مری حسرت ہو دل میں حاصلِ تقدیر کاغذ پر (۱۹۲۹ء)

مری تقدیر کا ہر جزو ہے تحصیلِ لاحاصل
سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر

وفورِ عشق سے واقف جو کوئی مجھ کو مل جائے
لکھا لوں ان بتوں کے وصل کی تدبیر کاغذ پر

لکھا جب حال سوزِ دل کا ہم نے جل گیا نامہ — ہوئی آثار ظاہر آہ کی تاثیر کاغذ پر

مے کا منت کش نہیں مستانۂ ابر بہار
اس قدر پر کیف ہے میخانۂ ابر بہار

ساقیِ جوشش آفریں کا کیوں نہ ہوں منت پذیر
میکشوں کے ساتھ ہے مے خانۂ ابر بہار

بادۂ گلگوں کا ہے بادِ بہاری میں اثر
روح پرور کیوں نہ ہو میخانۂ ابر بہار

چشمِ گریاں کی روانی کا بھی کچھ اندازہ ہو
تا کجا طولانیِ افسانۂ ابرِ بہار

منفعل برقِ تپاں ہے حسنِ دلبر دیکھ کر
زعم تھا اس کو کہ ہوں جانانۂ ابر بہار

دیکھ کر عالم کسی کی زلفِ عنبر فام کا
ہو گیا ہے دل مرا دیوانۂ ابرِ بہار

بہہ رہے ہیں اشکِ حسرت انقلابِ دہر کو
چشمِ گریاں ہے مری افسانۂ ابرِ بہار

زیرِ ابرو دیکھئے رعنائی چشمِ سیاہ
ہے خدا کے گھر میں بھی بتخانۂ ابرِ بہار

میکدے پر برق جب چمکی تو سمجھے بادہ کش

نور سے معمور ہے کاشانۂ ابرِ بہار
بادہ نوشی اس کے حق میں جوش افزا ہو گئی
اور بے خود ہو گیا دیوانۂ ابرِ بہار
روح پرور ہے چمن میں بادۂ گلگوں کا جوش
دیکھئے رنگِ رخِ مستانۂ ابرِ بہار
کیوں نہ اے اوتار میں مشغولِ مے نوشی رہوں
غیرتِ فردوس ہے پیمانۂ ابرِ بہار

(۱۹۲۱ء)
مری نظر کا ہے یہ تقاضا کہ درد سے دل کو آشنا کر
جفا کی آخر کوئی تو حد ہو اس ابتدا کی اب انتہا کر
تماشہ ہر روز دیکھتا ہوں میں انقلاباتِ آسماں کا
بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر
یہ صبر کی آزمائشیں ہیں یہ ضبط کا امتحاں ہے اے دل
ہزار پوچھیں وہ حال تجھ سے مگر نہ تو عرضِ مدعا کر
وقار کی ہے اگر تمنا یہی ہے رازِ وقار اے دل
اٹھا نہ ہرگز کسی کا احساں کسی سے ہرگز نہ التجا کر
وفا کی امید ہو وفا سے یہ تجھ کو اوتار کیا ہوا ہے
فریب کھائیگا تو کہاں تک کچھ انتہا ہے خدا خدا کر

(ڑ)

۷۶
خوبرو سیمیں بدن غنچہ دہانوں کو نہ چھیڑ
اے دلِ ناداں تو ایسے نوجوانوں کو نہ چھیڑ

مر رہے ہوں خود ہی جو ان نیم جانوں کو نہ چھیڑ
تو توانا ہے فلک ہم ناتوانوں کو نہ چھیڑ

قید کرتا ہے تو کر لے آشیانوں کو نہ چھیڑ
رحم کر صیاد ان اجڑے مکانوں کو نہ چھیڑ

ہے تشدد یار کا کافی ہماری جان پر
رحم کر تو اے فلک ہم خستہ جانوں کو نہ چھیڑ

تجھ سے اب الجھا ہوا شانہ ہے اے زلفِ سیاہ
کیا نہیں کہتا تھا میں تو اس کے شانوں کو نہ چھیڑ

ہے شبِ وعدہ نہ الجھا تو بنا کر زلف کو
اے صنم اب ایسے پیچیدہ بہانوں کو نہ چھیڑ

جب کیا شکوہ شبِ فرقت کا یوں کہنے لگے
وصل میں تو ہجر کے غمگیں فسانوں کو نہ چھیڑ

چارہ گر تو کر رہا ہے چارہ جوئی کس لئے
زخمہائے داغِ دل کے گلستانوں کو نہ چھیڑ

جانتا ہے دل یقیناً وہ سدھارے اپنے گھر

رحم کر اے رشک تو ہم بدگمانوں کو نہ چھیڑ

ہنس رہی ہے کیا تو اے ناعاقبت اندیش برق
دیکھ جل جائے گی ہم آتش فشانوں کو نہ چھیڑ

گر بسر کرنی تجھے آرام سے ہے زندگی
تو برائی کر نہ غیروں سے یگانوں کو نہ چھیڑ

قدرتِ خالق میں ہے کیا دخل تیری عقل کا
کچھ سمجھ اوتار اس کے کارخانوں کو نہ چھیڑ

غافل ہی کیا ہے کرتا ہے کیوں بار بار عرض (غ۱) سنتا نہیں وہ اے دلِ امیدوار عرض ۱۹۲۹ء
چھپ رہے ہیں وہ دمِ اظہارِ آرزو یاس آفریں ہوا اے دلِ حسرت شعار عرض
مُہر دہاں تھا بزم میں پاسِ ادب مگر میرے ہر اک اشارے سے تھی آشکار عرض

چشمِ بتاں میں جذبۂ مہر و وفا نہیں
اوتار کر رہا ہے عبث بار بار عرض

نام ہو۔ انعام لیں۔ شہرت ہو۔ اس سے کیا غرض ۱۹۲۹ء
بزم میں اغیار پر سبقت ہو۔ اس سے کیا غرض

جادۂ ہستی کے رہرو دیکھ سیدھی راہ چل
اس میں آسانی ہو یا زحمت ہو اس سے کیا غرض

کام کرنا فرض ہے تیرا تو اپنا کام کر

کچھ بھی حاصل ہو نہ ہو کلفت ہو اس سے کیا غرض
جو مناسب اور بجا ہے کام کر ایمان سے
اس میں بدنامی ہو یا عزت ہو اس سے کیا غرض
جو ہے تیرے پاس بیش و کم قناعت اس پہ کر
دوسروں کے پاس اگر ثروت ہو اس سے کیا غرض
بزم میں ہم ان کی اے غمخوار جائیں گے ضرور
ان کی جانب سے ہمیں دعوت ہو اس سے کیا غرض

۷۲ دعوئ جامِ جم غلط۔ خلد غلط۔ ارم غلط (ط) — شیخ تری قسم غلط۔ کرتا ہے تو تو غم غلط
پڑھ کے ہماری داستاں کہنے لگا وہ جانِ جاں — جھوٹ ہے یہ تو سب بیاں جو بھی کیا رقم غلط
حیف یہ آہ بے شرر رائگاں ہے بیان بے اثر — وہ میرے جوش عشق پر کہتے ہیں دم بدم غلط
کیوں ہوئے اس قدر خفا۔ اب نہ کرینگے ہم گلہ — تم جو کہو وہ ہے بجا۔ تم سے کہیں جو ہم غلط
کیا کریں شکوۂ ستم کہتا ہے ہم سے وہ صنم
جھوٹ ہیں سب غم و الم دعوئ چشم نم غلط

۷۳ دعوئِ عشق کہتے ہیں وہ سر بسر غلط — یہ اضطراب قلب غلط۔ چشم تر غلط
تشخیص ہی غلط ہو تو پھر کیا معالجہ — درماں غلط دوا ہے غلط چارہ گر غلط
راہِ وفا میں منزلِ راحت کہاں نصیب — رہرو غلط ہے راہ غلط راہبر غلط
بیکار عرض حال ہوا اس بت کے سامنے — کہتا ہے مسکرا کے وہ ہر بات پر غلط

تقدیر کی کجی ہے وہ پہنچے عدو کے گھر نکلا ہمارے جذبۂ دل کا اثر غلط

اوتار آشنا نہیں سعیِ تلاش سے

تہمت عبث لگاتا ہے تقدیر پر غلط

کھلے نہ وصل کی شب میں بھی تم اگر کیا لطف (ف) ۶ ۱۹۲۹

وہی حجاب رہا اور وہی نظر کیا لطف

فغاں و گریۂ پُر جوش سب یہ بے حاصل

نہ ہو جو نالۂ دل میں کوئی اثر کیا لطف

اُٹھیں نہ پاسِ حیا سے وہ شرمگیں آنکھیں

رہا وصال میں بھی ہجر کا اثر کیا لطف

دلِ فسردہ ہے الزامِ زندگی اب تک

لگایا بازیٔ الفت میں گر نہ سر کیا لطف

اٹھا کے پردۂ حائل وہ سامنے آئے

لڑی نہ آج تک ان سے مری نظر کیا لطف

نظر اٹھاؤ کہ پہلو تو ہو تڑپنے کا

ہیں اک زمانے سے بے حس دل و جگر کیا لطف

قفس میں ہم نے یہ کہہ کہہ کے دل کو بہلایا

پھرے جو کوچہ بکوچہ جو دربدر کیا لطف

زمانہ آگیا پیری کا اب تو لے اوتار
حواس باختہ۔ بے حس دل و جگر کیا لطف

۵۷

یہ آہِ سرد کب تک شغلِ چشم خونفشاں کب تک
رہے گا عاشقِ ناکام مصروفِ فغاں کب تک ۱۹۲۶ء

سراپا جرمِ عصیاں ہوں گنہ کی حد نہیں لیکن
پھریں گے میرے دن کیونکر بتا اے آسماں کب تک

وجودِ دل ہے کیا بس ایک قطرہ خونِ عاشق کا
رہیگا روز و شب شام و سحر وقفِ فغاں کب تک

نقابِ حُسن اُٹھ جائے گی شوقِ دید کے آگے
مری چشمِ تمنا سے رہے گا تو نہاں کب تک

عجب انداز سے وہ وصل کی شب ہم سے کہتے ہیں
سُناؤ گے تم آخر رنج و غم کی داستاں کب تک

کسی دن تو اسے اوتار بجلی ڈھونڈھ ہی لیگی
بچے گا اس کی زد سے یہ تمہارا آشیاں کب تک

ذوقِ نظر الگ الگ۔ فہم بشر الگ الگ
سارے ثمر الگ الگ سب کا اثر الگ الگ ۱۹۲۷ء

دل کی ہر ان کو جستجو۔ بو سے کی ہم کو آرزو

دونوں کھڑے ہیں رو برو گو ہے نظر الگ الگ

جانتا ہے وہ پُر غضب اُڑ نہیں سکتا صید اب
کھول دیا قفس کو جب کر دیئے پر الگ الگ

شیشہ نہیں یہ دل ہے ڈر کچھ تو نہیں زیان میں کر
رکھتا ہے جوہری مگر سنگ و گہر الگ الگ

غیر دل نے کچھ کیا عمل یار کا رُخ گیا بدل
رہتا ہے مجھ سے آجکل رشکِ قمر الگ الگ

بیٹھے ہیں تیرے در پہ ہم چشمِ کرم ہو اے صنم
تجھ کو خدا کی ہے قسم یوں نہ گذر الگ الگ

ایسا ہے دل یہ کج ادا جانتا ہی نہیں وفا
لفظ ہے گو دو حرف کا دیکھا مگر الگ الگ

شامِ شبِ وصال ہے دل کو مگر ملال ہے
ہونگے یہی خیال ہے وقتِ سحر الگ الگ

میں نے قصور کیا کیا مجھ سے ہوئی ہے کیا خطا
رہتے ہو کیوں خفا خفا آٹھوں پہر الگ الگ

(ل)

ڈھونڈھا ہوا اک صنم کو جو لیکر چراغِ دل — لبریز کیفِ عشق سے ہے ایاغِ دل
ہر زخمِ خونفشاں گلِ لالہ سے کم نہیں — وہ گلعذار کاش کرے سیرِ باغِ دل

خجلت سے مہر ابر میں روپوش ہو گیا
دکھلا دیا نفا میں نے فقط ایک داغِ دل
ملنے کا وعدہ اس بتِ کافر نے کر لیا
عرشِ بریں پہ پہنچا ہے اب تو دماغ دل
اک وُہی غمگسار تھا اک وہ ہی جاں نثار
مدت ہوئی کہیں نہیں ملتا سراغِ دل
پھیلاؤں پاؤں چین سے اوتارؔ کس طرح
دنیائے تنگ میں نہیں ممکن فراغِ دل

بزمِ جہاں میں کوئی نہیں آشنائے دل ۴۸
کس کو سناؤں کون سنے ماجرائے دل
جاتے ہیں آسمان پہ گو نالہائے دل
گوشِ آشنائے یار نہیں ہے صدائے دل
آئے کسی کے حال پہ رحم ان کو کس طرح
پتھر خدا نے جن کو دیا ہو بجائے دل
اوتارؔ جانتے ہو کہ بیدرد ہے وہ بت
اس کا کوئی گلہ بھی نہیں جب پہ آئے دل

۴۹
جلوۂ جانانہ ہم ہیں عاشقِ جانانہ ہم
حُسن ہم ہیں عشق ہم ہیں شمع ہم پروانہ ہم
جانتے ہیں زورِ دستِ نازکِ جانانہ ہم
جانبِ مقتل جبھی جاتے ہیں بیباکانہ ہم
بعد مدت قید سے صیاد کی چھوٹے ہیں اب
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اپنا باغ میں کاشانہ ہم
تو ہی جب سنتا نہیں اے مرجعِ اہلِ وفا

کس کو پھر جا کر سنائیں درد کا افسانہ ہم

پارساؤں کی جماعت میں بنے ہم پارسا
مجمعِ رنداں میں پیرِ مسلکِ رندانہ ہم

تشنہ لب جاتے ہیں واں آج تیری بزم سے
کیا دعائیں دیں گے تجھے اے ساقیِ میخانہ ہم

جب الجھنا ہی تھا قسمت میں الجھتے زلف سے
کاش بن جاتے دمِ زینت کسی کا شانہ ہم

حضرتِ دل کی توجہ کا اثر آخر ہوا
شعراے اونار اب کہتے ہیں استادانہ ہم

ہاتھ دھو بیٹھے یہاں آتے ہی اپنے دل سے ہم
درد بن کر اٹھ رہے ہیں اب تری محفل سے ہم

دوبدو ہوتے ہیں ہر دشواریِ منزل سے ہم
اور دلِ ناکام تیری سعیِ لاحاصل سے ہم

رہروِ راہِ طلب تو ہیں مگر بے رہنما
راستہ دشوار ہے۔ واقف نہیں منزل سے ہم

کون سنتا ہے ہماری داستانِ رنج و غم
چپکے چپکے آپ کہہ لیتے ہیں اپنے دل سے ہم

لے گیا شوقِ شہادت قتل گہہ تک تو ہمیں
اب یہ قسمت ہو وہاں بھی دور تھے قاتل سے ہم

لے کے کشتی چلدیا لنگر اٹھا کر ناخدا
دیکھتے ہی رہ گئے اس کو سر ساحل سے ہم

حُسنِ زیبا ہے پسِ پردہ تو عریاں دل غدار
کس طرح پھر دیں تجھے نسبت مہ کامل سے ہم

ترک مے کرنا بس اک امید پر کیا عقل ہے
بات اتنی پوچھتے ہیں واعظ عاقل سے ہم

آج اے ساقی پلا دے بادۂ کیف آفریں
حضرتِ زاہد کو لائے ہیں بڑی مشکل سے ہم

کثرتِ اغیار سے ہر ہر قدم پہ تھا ہجوم
آستانِ یار تک پہنچے بہت مشکل سے ہم

کیوں نہ ہو نازک خیالی کا مرقع ہر غزل
اک بتِ نازک بدن کو چاہتے ہیں دل سے ہم

راز دار و مونس و غمخوار ہے اوتار یہ
بے تکلف ہم سے دل ہو۔ بے تکلف دل سے ہم

(ن) ۸

اندیشۂ زوال رہا ہر کمال میں
اک عمر صرف ہو گئی فکرِ مآل میں

مستور تھے جو داغ دلِ پائمال میں — وہ آشکار ہوتے ہیں ماہ کمال میں
مستِ ازل ہیں جامِ محبت کے جرعہ کش — بیٹھے ہیں لو لگائے کسی کے خیال میں
آتے نہیں جو چشمِ تمنا کے سامنے — ہر وقت رہتے ہیں وہ ہمارے خیال میں
اللہ رے میری گرمیٔ پروانۂ خیال — دیکھو تو آگ لگ گئی عنقا کے بال میں
کہنا کسی کا وصل کی شب مسکرا کے یوں — بیکار وقت صرف ہو کیوں عرضِ حال میں

وہ فرطِ بیخودی ہے نہ وہ زہدِ خشک میں
اوتار لطف ملتا ہے جو اعتدال میں

۱۹۲۷ء
دل میرا پیچ و تاب میں جاں اضطراب میں — ۸۲ ڈالا مجھے شباب نے کیا کیا عذاب میں
ہو گی کمالِ شوق پہ موقوف دیدِ حسن — رخنے کرے گی چشمِ تمنا نقاب میں
ناکامیٔ نگاہ نے مجبور کر دیا — وہ حسنِ دل فروز نہیں اب حجاب میں
با چشمِ نم نکلتے ہیں دل سے شرارِ آہ — پھر بجلیاں تڑپنے لگی ہیں سحاب میں

عاشق ہوئے تھے حضرتِ اوتار کس لئے
کچھ بھی نہیں ہے صبر و تحمل جناب میں

## پیامِ خلد

۸۳
نشست بزمِ جہاں سے اٹھائے جاتے ہیں
چراغِ ہستیٔ فانی بجھائے جاتے ہیں

مسافروں کی طرح ہیں جو دارِ فانی ہیں
ہزار شکر ٹھکانے لگائے جاتے ہیں

حیات بندِ الم ہے سلاسلِ غم ہے
یہ روز روز کا جھگڑا اٹھائے جاتے ہیں

ہر اک عدم کا مسافر ہے فرق اتنا ہے
کہ پیشتر کوئی پیچھے بلائے جاتے ہیں

بقا کا ذکر عبث ہے جہانِ فانی ہیں
یہ جاتے جاتے تمھیں ہم جتائے جاتے ہیں

نقوشِ دہر غلط۔ وہم ہے فقط دنیا
یہ آپ کو دمِ رخصت بتائے جاتے ہیں

فنا ہی اصل میں آغازِ ہستیِ نو ہے
یہاں کے لوگ ارم میں بسائے جاتے ہیں

اس انتقالِ مکاں سے مکیں نہیں مرتا
وہ زندہ ہیں جو بظاہر جلائے جاتے ہیں

شکایتیں ہیں یہ بیجا عبث ہیں یہ شکوے
کہیں ہم آپ کو دل سے بھلائے جاتے ہیں

نگاہِ غیر سے مستور ہو کے ہم اب تو

فقط تمہارے ہی دل میں سمائے جاتے ہیں

یہ عرض حضرتِ کیفیؔ سے ہے بصد تعظیم
وہ چرخِ پیر کے دھوکے میں آئے جاتے ہیں

امید ہے کہ وہ باور کریں گے۔ ہم اوتارؔ
پیامِ حضرتِ کیفیؔ سنائے جاتے ہیں

ایسا بھی کوئی شعر ہے جو غم فزا نہیں ۔۔ اوتارؔ کے کلام میں کچھ بھی مزا نہیں
کچھ بھی مری نگاہ میں تیرے سوا نہیں ۔۔ اک تو ہی تو ہے اور کوئی دوسرا نہیں
کیا اس سے حالِ دل کہیں جو آشنا نہیں ۔۔ صورت بھی تو ہماری وہ پہچانتا نہیں
بیکار اپنا وقت نہ کر چارہ گر خراب ۔۔ دل میں مرے وہ درد ہے جس کی دوا نہیں
سوزِ غمِ نہاں سے ہے وہ شوخ بے خبر ۔۔ جس نے دیا ہو درد وہ درد آشنا نہیں
گلزارِ دہر میں ہے تو ایسا گلِ حسیں ۔۔ رنگِ لطیف جس میں ہو بوئے وفا نہیں
رنگتا ہے خونِ عاشقِ ناکام سے وہ پاؤں ۔۔ تلوؤں کو اس کے حاجتِ رنگِ حنا نہیں
وہ چاہتا ہے لذتِ آزار بھی نہ دے ۔۔ ترکِ ستم سے مقصدِ ترکِ جفا نہیں
وہ خون ہی نہیں ہے جو جوش میں نہ آئے ۔۔ دل ہی نہیں وہ جس میں کوئی مدعا نہیں
وہ حالِ اضطرابیٔ دل سن کے بار بار ۔۔ پھر پوچھتے ہیں بزم میں گویا سنا نہیں
رخصت کے وقت کہتا ہے ہر راہیٔ عدم ۔۔ اس چند روزہ عمر میں کچھ بھی کیا نہیں
وارفتگیٔ عشقِ جنوں ساز دیکھئے ۔۔ دل کی خبر نہیں مجھے اپنا پتا نہیں

دل میں ہی درد۔ درد سکونِ دلِ حزیں
دل اور درد دونوں ہیں باہم جدا نہیں

دیکھا جو چشمِ غور سے اوتارِ رند کو
جتنا زمانہ کہتا ہی اتنا بُرا نہیں

۸۵ اِک سراپا حسن کی الفت کا دم بھرتا ہوں میں
یاد میں اس کی ہوں گریاں ہجر میں مرتا ہوں میں

بھولنے والا ہے دل پھر قصۂ طور و کلیم
شاہدِ یکتا کے شوقِ دید سے ڈرتا ہوں میں

شیخ صاحب کو مبارک مسجد و کعبہ رہے
بتکدے میں بیٹھ کر یادِ خدا کرتا ہوں میں

اس کی فرقت میں مرا یہ حال ہے اے ہم نشیں
مر نہیں سکتا اگرچہ رات بھر مرتا ہوں میں

ہوش سے ناآشنا ادراک سے ہوں بے خبر
کیا بتاؤں تم کو اے اوتار کیا کرتا ہوں میں

۸۶ دلِ داغِ اصنامِ مہ وش کے خدا جانے کہاں ہیں
زمیں پر رہنے والے ہیں نگاہیں آسماں پر ہیں

محبت میں نہیں زیبا لبِ فریاد وا کرنا
دیا ہے دل اگر تم نے تو شکوے کیوں زباں پر ہیں

ریاضِ دہر میں ہیں جابجا کتنے ہی کاشانے
نگاہیں برق کی لیکن مرے ہی آشیاں پر ہیں

شبِ فرقت کوئی پیماں شکن آیا نہ آئے گا
امیدیں اپنی ساری اب تو مرگِ ناگہاں پر ہیں

بگڑ کر پوچھتا ہے وہ ستمگر اپنے درباں سے
نشانِ سجدۂ اہلِ وفا کیوں آستاں پر ہیں

سنا ہے حضرتِ اوتار بھی ہیں لطف کے طالب
کوئی پوچھے تو کیوں عاشق کسی نامہرباں پر ہیں

جو نصیب لطف ہے شمع کو سرِ بزم سوز و گداز میں
نہ ملے گا حضرتِ خضر کو وہ کبھی حیاتِ دراز میں

مری چشمِ شوق و پر آرزو مرے قلبِ عشق نواز میں
نظر آئیں ساری حقیقتیں جو نہاں تھیں پردۂ راز میں

ہو سکون و ضبط تو کیا مزا نہ ہو مضطرب تو ہے لطف کیا
کہ نوائے دلکش و کیف زا تو ہے اضطرابِ ساز میں

وہی الجھنیں وہی پیچ و خم وہی تیرگی ہے وہی کجی
شبِ ہجر میں وہی طول ہے جو ہے اُن کی زلفِ دراز میں

یہ ہے حسن و عشق کی داستاں کہ ہمارا اک دلِ ناتواں

رہا شغل سوز و گداز میں ہوا صرف ناز و نیاز میں

ترے دل میں حور کی آرزو نہ خدا کو دے یہ فریب تو
ہے نمایاں حرص و غرض کی بو تری عمر بھر کی نماز میں

تو نہاں بھی ہے تو عیاں بھی ہے تو یہاں بھی ہے تو وہاں بھی ہے
سر خاک تو سر عرش تو۔ تو نشیب میں تو فراز میں

نہ ملے کوئی مجھے مہرباں نہ سنے کوئی مری داستاں
نہ بنے کوئی مرا رازداں یہی لطف ہے مرے راز میں

ہمیں دشمن سمجھتے ہیں عدو کو یار کہتے ہیں
غضب کرتے ہیں الٹی بات اے سرکار کہتے ہیں

دعا دشنام کو سمجھے جفاؤں کو وفا جانا
عداوت کو محبت وہ ستم کو پیار کہتے ہیں

یہ طرز دلربائی ہے یہ شان دلنوازی ہے
ہمیں عاشق کہو تم ہم تمہیں دلدار کہتے ہیں

کوئی محو خرام ناز ہے عشاق سے کہدو
اٹھے گا حشر یہ فتنے دم رفتار کہتے ہیں

ستم آرا ترے بیمار غم کو ناز ہے اس پر
کہ تیری نرگسی آنکھوں کو بھی بیمار کہتے ہیں

ہوئی ہے خود فراموشی ہی حاصل غم فراموشی
وہ مست میکدہ ہیں ہم جسے ہشیار کہتے ہیں

تمہارے بادۂ الفت سے جو مخمور ہو جائے
اسی تقدیر والے کو یہاں میخوار کہتے ہیں

شب وعدہ نہ آنے کے گلہ پر ہنس کے فرمایا
دیار حسن میں انکار کو اقرار کہتے ہیں

سر محفل تمہیں یوں بے حجاب آنا نہیں زیبا
ذرا دل میں یہ سوچو تو کہ کیا اغیار کہتے ہیں

ہوئے ہم جب سے شامل دل پرستوں کی جماعت میں
اسی دن سے نہایت دلپسند اشعار کہتے ہیں

ہمیں سے پوچھتے ہیں وہ بتاؤ کیا کہیں اُن سے
کہاں رہتے ہیں جن کو حضرتِ افگار کہتے ہیں

غزل

۸۹ حریفانِ جہاں دریا کو اک قطرہ سمجھتے ہیں
یہ عالم ہے یہاں قطرہ کو بھی دریا سمجھتے ہیں
کبھی بیدل کبھی مجنوں کبھی شیدا سمجھتے ہیں
سمجھ ہی میں نہیں آتا ہمیں وہ کیا سمجھتے ہیں
وہی دردآشنا کچھ رازِ الفت کا سمجھتے ہیں
نشاطِ زندگانی جو فنا ہونا سمجھتے ہیں
حقیقت آشنا جو ہیں تمھارے دیکھنے والے
ہر اک ذرہ کو عکسِ حسن کا جلوا سمجھتے ہیں
ظریفانہ ستم ہے اُن کا کیا وہ ایسے ناداں ہیں
جو میری داستانِ غم کو افسانہ سمجھتے ہیں
حقیقت بیں نگاہوں میں حیاتِ جاودانی ہے
جسے ہم اپنی نادانی سے مرجانا سمجھتے ہیں
حقیقت یہ ہے زندانی ہیں پابندِ گلستاں ہیں
ریاضِ دہر کو جو اپنا کاشانہ سمجھتے ہیں
سمجھ کا پھیر ہے اگلی کہ قسمت کی کجی تیری      جو ہر اک بات کو افگار وہ اُلٹا سمجھتے ہیں

۹۰
گل مست تھے بلبل بھی تھی دیوانہ چمن میں
دیکھا نہ کوئی ہم نے تو فرزانہ چمن میں

ہم سے نہ کرو سیرِ گلستاں کا تقاضا
بے یار نظر آتا ہے ویرانہ چمن میں

مدت سے قفس میں ہوں مجھے یاد نہیں ہے
سنتا ہوں کبھی تھا مرا کاشانہ چمن میں

گل دیکھ کے یاد آئی بہارِ گلِ رخسار
ہر سو نظر آیا رخِ جانانہ چمن میں

شاداں ہوں قفس میں نہیں صیاد کا کھٹکا
اک دن بھی کبھی چین سے گذرا نہ چمن میں

جو غنچہ کھلا باغ میں گل چیں نے اڑایا
اس سے یہی بہتر تھا کہ کھلتا نہ چمن میں

گل دیکھے اگر اس بتِ طناز کی صورت
دعویِ نزاکت کرے اصلا نہ چمن میں

در پردہ ہر اک غنچہ کا صد چاک ہے سینہ
کر اور فغاں بلبلِ شیدانہ چمن میں

ادتار مزہ پینے کا ہو اور زیادہ
قسمت سے جو میکش کا ہو میخانہ چمن میں

٩١
عجب جادو ہے تیری اس ادائے سامری فن میں
کہ مارِ زلف لپٹائے ہوئے ہے اپنی گردن میں

فقط فرقِ مکاں ہے طالبِ مقصود ہیں دونوں
اگر سمجھو تو جھگڑا کچھ نہیں شیخ و برہمن میں

غضب تیری نگہ تھی جس نے ظالم برق بن بن کر
لگا دی آگ اے صیاد میرے ہی نشیمن میں

بس ایسا وادیٔ غربت میں ہوں گم کردہ منزل
نہیں محسوس جس کو فرق رہبر اور رہزن میں

بگڑتا کیا ترا صیاد ہم ہیں طائرِ بے پر
قفس کو جا کے رکھ دیتا اگر تو صحنِ گلشن میں

نہ لطفِ زندگی پایا نہ مرنے پر ہی چین آیا
پڑے خاک ایسے جینے پر لگے آگ ایسے مدفن میں

تری اس آتش افشانی سے کیا اے برقِ اندیشہ
نہیں کچھ بھی بجز جنسِ معاصی میرے خرمن میں

دمِ آخر رہا یہ انتظارِ یار عاشق کو
لگے تھے کان آہٹ پر گڑی تھی آنکھ روزن میں

بس اے او تار وہ آتش بجاں آتش بداماں ہوں لئے پھرتا ہوں ٹکڑے برق کے بھی اپنے دامن میں

ڈھونڈھتا ہوں مقصدِ عمرِ رواں ملتا نہیں
رہرو بے رہنما ہوں کارواں ملتا نہیں

خوش ہوں غربت میں جو کوئی ہمزباں ملتا نہیں
رازِ پوشیدہ ہی جب تک رازداں ملتا نہیں

قید سے ہم کو رہا صیاد نے تو کر دیا
اب یہ قسمت ہے نشانِ آشیاں ملتا نہیں

شکوۂ تقدیر کیوں کرتا ہے اے راحت طلب
کچھ بھی بے تدبیر زیرِ آسماں ملتا نہیں

ہے سمندِ عمر مثلِ برق گو پیہم رواں
منزلِ مقصود کا لیکن نشاں ملتا نہیں

تھی جبیں اپنی کبھی مصروفِ سجدہ اور اب
سر پٹکنے کو بھی سنگِ آستاں ملتا نہیں

گوشۂ دل میں ذرا چشمِ حقیقت سے تو دیکھ
کون کہتا ہے کہ وہ جانِ جہاں ملتا نہیں

وادیٔ غربت میں ہوں وہ رہروِ گم کردہ راہ
جس کو کوئی نقشِ پائے رہرواں ملتا نہیں

کیونکر اے اوتار عرضِ مدعا اس سے کروں
اب کہیں بھی وہ بتِ نامہرباں ملتا نہیں

۹۳ قالبِ پژمردہ کو اپنے شاد کر لیتا ہوں میں ۱۹۱۲ء
شامِ غربت میں وطن کو یاد کر لیتا ہوں میں

گو نہیں ارماں ہجومِ یاس و حسرت ہی سہی
خانۂ دل کو یونہی آباد کر لیتا ہوں میں

کاٹنے والے ہیں وہ اس جرم پر میری زباں
آسماں سے شکوۂ بیداد کر لیتا ہوں میں

سخت جانی ہو سرِ مقتل عجب جوش آفریں
امتحانِ بازوئے جلاد کر لیتا ہوں میں

واہ اے جوشِ تصور۔ واہ اے حسنِ خیال
اس دلِ ناشاد کو بھی شاد کر لیتا ہوں میں

قید میں ہوں پر کٹے ہیں کاٹتا ہے کیوں بال
بس یہی تو نالہ اے صیاد کر لیتا ہوں میں

اڑ کے جاتے ہیں شرارے آہ کے سوئے فلک
بند اپنے جب لبِ فریاد کر لیتا ہوں میں

ہو گیا ہوں اس قدر اب خوگرِ جور و جفا

اپنے خوں میں خود دستِ ستم ایجاد کر لیتا ہوں میں

بت پرستی گو ہے اے اوتار اک شغلِ عبث
اس بہانے سے خدا کی یاد کر لیتا ہوں میں

یہ جانتا ہوں زہد ہے سعیِ ثواب میں ۹۴ ڈوبا ہوا ہے دل مرا لیکن شراب میں
سوئے جو بام پر وہ شبِ ماہتاب میں — انجم فلک سے ٹوٹ پڑے اضطراب میں
رہتا ہے روئے یار ہمیشہ نقاب میں — بجلی ہو آسمان پہ جیسے سحاب میں
یہ جانتا تو لیکے میں جاتا خود اپنا خط — قاصد کی لاش آئی ہے خط کے جواب میں
ہے ہیچ جس کے سامنے برقِ حیات سوز — وہ لطفِ خاص پاتا ہوں چشمِ عتاب میں
بت سامنے ہیں حور کا وعدہ ہے دور کا — کیوں آؤں دامِ شیخِ فضیلت مآب میں
دل کو ہوا ایک شاہدِ گل پیرہن کا عشق — دے ساقیا شراب ملا کر گلاب میں
نادان گلرخوں سے امیدِ نگاہِ لطف — ہے جستجو سراب کی امیدِ آب میں
غافل نفس کی قید بظاہر حیات ہے — کب تک رہیگی بند ہوا اس حباب میں
میرا شمارِ جرم فرشتے نہ کر سکے — محشر کا دن تمام ہوا اس حساب میں
تھے محوِ کارِ ہستیٔ موہوم عمر بھر — بعدِ وفات سمجھے کہ دیکھا تھا خواب میں
شیخ سفید ریش نہ افشائے راز کر — چمکیگی اور دل کی سیاہی خضاب میں
پیری میں رو رہے ہیں عبث ہم شباب کو — بھولے ہوئے تھے ہم یہ زمانہ شباب میں
اوتار جس کی ذات غفور الرحیم ہے — خم کر سرِ نیاز اسی کی جناب میں

یہی ہے مدعا اس بت کی چتون کے اشاروں میں
کہ چل جائے کوئی تیرِ نظر شامت کے ماروں میں

دلِ پرجوش ہو کس برق وش کے بیقراروں میں
مبدل ہیں مری آنکھوں کے آنسو بھی شراروں میں

درِ دولت پہ جاتے ہیں وہ پوچھیں گے تو کہہ دیں گے
کہ ہم بھی خاکساروں میں ہیں ہم بھی جانثاروں میں

مجھے ہے ناز دل پہ اور دل کو ناز ہے مجھ پر
یہ میرے رازداروں میں ہیں اسکے غمگساروں میں

زمانے کے حسینوں میں ہے یکتا وہ جہاں آرا
کہ جیسے آسماں پر چاند روشن ہو ستاروں میں

مرے داغِ معاصی دھو دیئے اشکِ ندامت نے
ہوا میں سرخرو شامل ہوا جب شرمساروں میں

جہاں ہے وہ پری رو اک جماعت ہے رقیبوں کی
کہا ہے سچ کسی نے پھول کا مسکن ہے خاروں میں

دیا ہے مرتبہ عالی خدا نے نسلِ آدم کو
شعاعِ مہر اور نورِ قمر ہے خاکساروں میں

دعا زباں پہ ہے جھک کر سلام کرتے ہیں ۹۷ وہ ہیں خموش مگر ہم کلام کرتے ہیں

جہانِ جود میں پیدا وہ نام کرتے ہیں
جو کرکے ترکِ طلب خیرِ عام کرتے ہیں
رہِ خودی کی جو منزل تمام کرتے ہیں
وہ نوش بادۂ عرفاں کا جام کرتے ہیں
وصالِ یار کی خواہش مدام کرتے ہیں
بہ شغلِ اہلِ وفا صبح و شام کرتے ہیں
نہ روؤں کسلئے میں زیرِ سایۂ دیوار
مدام عیش وہ بالائے بام کرتے ہیں
فنا بھی سہل ہے ہم عاشقوں کو اے اوتار
جو کام کرنے پہ آئیں وہ کام کرتے ہیں

۹۷
محرومِ ہر نشاط ہوں وہ بد نصیب ہوں
گو آج تنگ وطن میں ہوں لیکن غریب ہوں
مجھکو مرض ہے وہ نہیں جسکی کوئی دوا
غمخوار میرا کون ہو میں بے طبیب ہوں
تو حسن میں تو میں ہوں محبت میں لاجواب
تیری نہیں مثال تو میں بھی عجیب ہوں
کہتے ہو بزم میں مجھے اوتارِ خستہ دل
پھر بھی ہوں شادماں کہ تمھارے قریب ہوں

۹۸
دل اس فتنہ گر سے لگانے لگے ہیں
محبت کے لطف اب اٹھانے لگے ہیں
بتوں سے ہم الفت جتانے لگے ہیں
متاعِ دل و جاں لٹانے لگے ہیں
تری بزم میں اعدا آنے جانے لگے ہیں
صلہ اب محبت کا پانے لگے ہیں

نسیم سحر کے ہیں جھونکے وہ دلکش — سرِ بختِ خفتہ جگانے لگے ہیں
جو کی بزم آراستہ بھی انھوں نے — تو ہم کو بھلا کب بلانے لگے ہیں

بہار آگئی روح پرور ہے منظر
طیورِ چمن راگ گانے لگے ہیں

سنہ ۱۹۵۶ء

ہجر میں وصلِ یار کی باتیں — ۹۹ — ہیں دلِ بے قرار کی باتیں
ہنس دیا سن کے وہ ستم پرور — دلِ امیدوار کی باتیں
ذکرِ رخسار و نشترِ مژگاں — ہیں گل و نوکِ خار کی باتیں
اس کی سختی میں ہی نہاں نرمی — دشمنی میں ہیں پیار کی باتیں
عرصۂ حشر میں ہیں عفو طلب — عاصیِ شرمسار کی باتیں
کوہکن عشق سے ہے بے بہرہ — اس نے سن کو ہسار کی باتیں
یہ تو بتلا کہ کیا جواب ملا — تو نے اے دل ہزار کی باتیں

ہم کو ادنیٰ کرتی ہیں رسوا
دلِ بے اختیار کی باتیں

سنہ ۱۹۵۶ء

کوئے قاتل سے جو گذرتے ہیں — ۱۰۰ — موت کے گھاٹ وہ اترتے ہیں
بدگماں ہیں جو سنگدل صیاد — وہ قفس میں بھی پر کترتے ہیں
عشق میں ہے فنا دلیلِ بقا — ڈوبتے جو ہیں وہ ابھرتے ہیں
بدگماں دل کو ہوتی ہے الجھن — بال اس بت کے جب سنورتے ہیں

منزلِ عشق طے کرینگے وہ کیا
راہِ پُر خار سے جو ڈرتے ہیں

۱۰۱ رنجِ ناکامی ہے لیکن یاس کی شدت نہیں ۱۹۲۲ء
سعی بے حاصل ہماری سعی بے لذت نہیں

حور طلعت ہے مگر تو داخلِ جنت نہیں
نور کی صورت تو ہے لطفِ آفرینش سیرت نہیں

کیوں اسیرِ حلقۂ گیسو نہ ہوں اے چارہ جو
کیا جنوں مجھ کو نہیں سودا نہیں وحشت نہیں

دیکھ تو کیا کہہ رہی ہے یہ نگاہِ منفعل
کس طرح مانوں کہ تجھ کو غیر سے الفت نہیں

ہے یہی کافی تصور اُس رخِ پر نور کا
کچھ شبِ غم ماہِ عالم تاب کی حاجت نہیں

بدگماں کیوں ہیں، نہیں تو اگر رنجش کوئی رنج
ترکِ الفت آپ کے اطوار کی عادت نہیں

۱۰۲ یوں جلائیں آہ نے تارِ نفس کی تیلیاں — برق سے جل اٹھیں جیسے خشک خس کی تیلیاں ۱۹۲۲ء
اللہ اللہ اس قدر شوقِ اسیری ہے مجھے — آپ چنتا ہوں میں اپنے قفس کی تیلیاں
ہائے وہ بھی تو نہ چھوڑیں سنگدل صیاد نے — آشیانے میں جو تھیں دو چار خس کی تیلیاں

ایک ہی شے مختلف ترتیب سے دے عیش و رنج
آشیاں کی تیلیاں ہوں یا قفس کی تیلیاں

قید میں اوتار یوں ہم پر کھلے بیٹھے رہیں
کاش ہو جائیں قفس میں اپنے بس کی تیلیاں

بندۂ عشقِ بتاں جنت کا شیدائی نہیں ۱۰۳
زلفِ حورِ خلد کا زاہد یہ سودائی نہیں
کیوں ہوئے ناصح مری جامہ دری پر طعنہ زن
میں ہوں سودائی مجھے شوقِ تن آرائی نہیں
آفتِ پیہم کا مرجع یہ دلِ رنجور ہے
میرے غم خانہ میں کب غم کی بلا آئی نہیں
حلقۂ زنجیر تیری تو حقیقت کچھ نہیں
قیدِ زنداں سے طبیعت میری اکتائی نہیں
ضبط کر تو ضبط کر طوفانِ گریہ ضبط کر
اے دلِ مغموم اگر منظور رسوائی نہیں
رات جب وہ بام پر آئے تو مارے شرم کے
آسماں پر چاند کی صورت نظر آئی نہیں

پا بزنجیر ہوں مگر سنت سے میں آزاد نہیں ۱۰۴
ہمہ تن درد ہوں اور طاقتِ فریاد نہیں
کچھ شکایت مجھے تجھ سے ستم ایجاد نہیں
دلِ مجروح مرا مائلِ فریاد نہیں
وہ نظارۂ ترکِ جفا یاد دلانا تھا عبث
یہ ستم دیکھئے فرماتے ہیں کچھ یاد نہیں
حسرت و رنج و غم و یاس و الم رہتے ہیں
جب سے پہلو میں ہمارے دلِ ناشاد نہیں

کام بن جائے کوئی میرا یہ ممکن ہی نہیں ۱۰۵
شبِ غم کیا تری قسمت میں کبھی دن ہی نہیں
تیرہ بختی سے ہوں ناکامِ تمنا اب تک
رات ہی رات ہے قسمت میں مری دن ہی نہیں

فلکِ پیر نے بھی جو ستم ڈھائے ہیں
دشمنِ جانِ حزیں وہ بتِ کمسن ہی نہیں

حاہے اس کی چڑھاتے ہیں وہ پھر من مانے
بات پا جاتے مرے دل کی کہے بن ہی نہیں

سوجھے ہیں اس کی ہوسناکی سے اندازِ وفا
ہے عدو تو مرا استاد بھی محسن ہی نہیں

۱۰۶ توصیفِ حسن کر سکے میری زباں نہیں
میں مانتا ہوں مجھ میں کمالِ بیاں نہیں

کہتے ہیں جس کو راز وہ ہرگز نہاں نہیں
وہ راز ہی نہیں ہے اگر رازداں نہیں

اللہ رے میرا ضبط کہ لب پر فغاں نہیں
نکلے جو دل سے آہ تو اس میں دھواں نہیں

ترکِ ستم سے مدعا ترکِ گماں نہیں
منظور ان کو آج مرا امتحاں نہیں

دل ہی نہیں وہ جس میں کہ عشقِ نہاں نہیں
وہ عشق کیا ہے جس میں کہ بیتابیاں نہیں

وہ حسن کیا ہے جس میں ذرا شوخیاں نہیں
وہ عشق کیا ہے جس میں بھری گرمیاں نہیں

سجدے ہزار دیر و حرم کے مجھے قبول
لیکن غلط کہ اور کہیں آستاں نہیں

گمنام ہو کے ہو گیا مشہورِ دو جہاں
عنقا جو بے نشاں ہے تو کیا بے نشاں نہیں

روزِ ازل سے اس کا ہے مسکن حریمِ دل
نافہم ڈھونڈتا ہے کہاں ہے کہاں نہیں

کچھ بھی تو میری عرضِ تمنا کا دو جواب
سر کو ہلا کے اتنا ہی تم کہہ دو ہاں نہیں

۱۰۷ ہاں نہیں ہرگز نہیں وہ دل نہیں
جو تمہارے عشق کے قابل نہیں

وہ بگڑ بیٹھے کہا جب صاف صاف
یہ میرا دل ہے تمہارا اتل نہیں

کوششِ دشوار کی لذت تو ہے — سعی ہے ناکام ۔ لاحاصل نہیں
لیکے دل کہنے لگے وہ ناز سے — اب ہمارا ہے یہ تیرا دل نہیں
مرحلے راہِ طلب کے رہ گئے — تھی یہی مشکل کہ کچھ مشکل نہیں
بحرِ الفت میں ہے کشتی عشق کی — ناخدا دل ہے ۔ کوئی ساحل نہیں
ترکِ مے امیدِ کوثر پر کروں — واعظو ایسا تو میں جاہل نہیں
ہوں بہت مصروفِ کارِ روزگار — پھر بھی فکرِ شعر سے غافل نہیں

## حضرت اوتار رہبی پیرِ مغاں

بزم وہ کیا جس میں شمعِ حسن شامل نہیں

شمعِ حسن کا پروانہ ہوں ۱۰۸ — بادۂ عشق کا مستانہ ہوں
ظاہراً عشق کا دیوانہ ہوں — اصل میں جلوۂ جانانہ ہوں
دل مرا جلوہ گہِ حسنِ بتاں — میں حقیقت میں پریخانہ ہوں
الجھنیں پڑتی ہیں ہر کام میں کیوں — کیا کسی زلف کا میں شانہ ہوں
خود فراموشی سے ہوں دل میں شاد — مست ایسا ہوں کہ فرزانہ ہوں
تو جفا کار ستمگار سہی — مہر و الفت کا میں کاشانہ ہوں
میں ہوں گردش میں سرِ محفلِ ناز — ساقیٔ عشق کا پیمانہ ہوں

میں ہوں اوتار غریب و مفلس
گو بہ اندازِ امیرانہ ہوں

۱۰۹ رسوائیاں نظر میں ہوں وہ عاشقی نہیں
اوتارؔ دل لگانا کوئی دل لگی نہیں

حُسنِ بتاں میں دیکھیئے اک شان کبریا
ان مہوشوں کا عشق کوئی کافری نہیں

بیکار کر رہے ہو فسردہ تو شمارِ جرم
میں منفعل ہوں رحمتِ حق کی کمی نہیں

جب سے ہوا ہے دوست ہمارا وہ فتنہ گر
چرخِ کہن کو ہم سے کوئی دشمنی نہیں

مٹ جائے نقشِ یار مرے لوحِ قلب سے
کہتا ہوں سچ یہ مجھکو گوارا کبھی نہیں

اے دل بقولِ حضرت غالبؔ خدا گواہ
"قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں"

اوتارِ بادہ نوش کو واعظ برا نہ جان
مے کش وہ ہے ضرور طبیعت بری نہیں

۱۱۰ روداد اپنے عشق کی ان کو سنائے کون
مانے نہ جو کسی کی تو اس کو منائے کون

اپنی یہ آن ہے کہ نہ جائینگے بے طلب

اور آپ کا یہ طرزِ عمل ہے بلائے کون

دِل تو بتوں کے عشق میں پہلے ہی دے دیا
اب سوچتا ہوں نازِ تغافل اُٹھائے کون

وہ زلفِ دوتا ہے اگر باندھتے ہیں ۱۱۱ تو دل باندھتے ہیں جگر باندھتے ہیں
رُخ و زلف پیشِ نظر ہے ہمارے مضامینِ شام و سحر باندھتے ہیں
یہ شیوہ ہے بے رحم صید افگنوں کا
قفس میں بھی بلبل کے پر باندھتے ہیں

نا آشنا کہوں تجھے یا آشنا کہوں ۱۱۲ تو ہی بتا کہ کیا نہ کہوں تجھ کو کیا کہوں
مجھ کو گلے جو پوچھو تو ان سے ہزار ہیں اُن کے ہی سامنے انھیں کیونکر برا کہوں
نورِ خدا ظہورِ خدا قدرتِ خدا کافر میں کیوں کہوں تجھے ظلِ خدا کہوں
خود ان کو چھیڑ چھیڑ کے سنتا ہوں گالیاں دشنام کو میں کس طرح پھر بے مزا کہوں
تو نے اے شمع رو مجھے پروانہ کر دیا جادو کہوں فسوں کہوں یا فتنہ زا کہوں
شیوہ ہے دِل ربائی ترا نام دل ربا
کیوں کر نہ فتنہ گر تجھے میں دلربا کہوں

زندگی یوں تمام کرتے ہیں ۱۱۳ صبح کرتے ہیں شام کرتے ہیں
ہم ہیں مصروفِ التجا اور وہ عیش بالائے بام کرتے ہیں
زلف و رخ پر جو ہیں فدائے عشق ایک جا صبح و شام کرتے ہیں

مجھ سے بدظن ہیں کس لئے؟ وہ تو
بخششِ خاص و عام کرتے ہیں

۱۱۴ چھپ کے نظروں سے بھی تو اب کوئی مستور نہیں
سخت ہے منزلِ مقصود مگر دور نہیں

ہائے اظہارِ وفا کا بھی تو موقع نہ رہا
امتحانِ دلِ شیدا انھیں منظور نہیں

یہی بہتر ہے کہ اب موت ہی آجائے مجھے
سامنے نظروں کے جب بادۂ انگور نہیں

وہ شبِ وعدہ نہ آئے تھے اجل ہی آتی
کوئی تسکین کا پہلو دلِ مجبور نہیں

غیر کا دل مجھے دیتے ہو غضب کرتے ہو
بندہ پرور یہ تو میرا دلِ رنجور نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہے جوشِ تمنا کا فریب
دلِ حسرت زدہ ہرگز یہ رہِ طور نہیں

نگہِ ساقیِ محفل سے ہے بے خود کوئی
کیا ہوا بادۂ گلگوں سے جو مخمور نہیں

نظر آتے ہیں فضا میں بھی تو پیہم جلوے

زینتِ دل بھی ہو تم آنکھ سے بھی دور نہیں

دلِ وارفتہ نے رکھا نہ کہیں کا مجھ کو

ورنہ قسمت سے تو او قنّار میں مجبور نہیں

۱۱۵ ہم بیانِ حالِ زار کرتے ہیں — آپ سننے سے عار کرتے ہیں
ہے ترقی پہ اور جوششِ وفا — سختیاں وہ ہزار کرتے ہیں ۱۹۱۰ء
اک نگاہِ کرم ادھر بھی ہو — کب سے ہم انتظار کرتے ہیں

موسمِ گل کے آتے ہی وحشی
پیرہن تار تار کرتے ہیں

۱۱۶ تو کس کی چشمِ شوق میں جلوہ نما نہیں ۱۹۰۹ء
تیری طرح جہاں میں کوئی دوسرا نہیں

بحرِ جہاں میں کیوں پھرا بھرتا ہے اے حباب
تجھ میں تو کچھ بھی بند ہوا کے سوا نہیں

قرباں کوئی بتوں پہ کسی کو خیالِ حور
اس دہر میں کسی کو بھی یادِ خدا نہیں

ناداں نہ کر غرورِ زرِ بے ثبات پر
اس کا قیام صورتِ ہر ایک جا نہیں

لطفِ حیات دورِ جوانی کے ساتھ ہے

ذکرِ بہار کیا جو کوئی گل کھلا نہیں

زاہد کو عشقِ حور ہے محوِ بتاں ہوں میں
سچ ہے کہ اس جہاں میں کوئی یار سا نہیں

ازل ہی سے تیری یاد میں مر رہا ہوں
جو جینے کا مقصد ہے وہ کر رہا ہوں

تمھاری محبت کا دم بھر رہا ہوں
میں جیتے ہی جی جان سے مر رہا ہوں

یہ حالت ہوئی اے ہمنشیں بیخودی کی
نہیں جانتا خود کہ کیا کر رہا ہوں

ہوں اب اسقدر خوگرِ جور ہمدم
خود ایجاد سارے ستم کر رہا ہوں

ہوئی مرگِ شادی شبِ وصل ہے ہے
کہ کرنا تھا کیا اور کیا کر رہا ہوں

مرے پیار پر ان کو آتا ہے غصہ
میں غصہ پہ بھی پیار پھر کر رہا ہوں

ہوئی باعثِ ارتکابِ جرائم
تری شانِ رحمت سے میں ڈر رہا ہوں

سوز سے خالی ہے جو اور درد کا حامل نہیں
آپ چاہے دل کہیں اس کو مگر وہ دل نہیں

جور کی بھی ہے شکایت درد کا بھی ہے گلہ
اس طرح کے عشق کرنے کا تو میں قائل نہیں

جس کو کہتے ہیں محبت جس کا الفت نام ہے
وہ ہے بحرِ بیکراں اس کا کوئی ساحل نہیں

غافل و گم کردہ رہ اے رہروِ بے رہنما
بے خبر منزل کہاں یہ جادۂ منزل نہیں

وہ کبھی دن تھے جبکہ ہر مشکل مری آسان تھی
آج آسانی نہیں کوئی بھی جو مشکل نہیں

اے تغافل کیش اے ناواقفِ رسمِ وفا
اے بتِ کافر ِنما۔ پہلو میں تیرے دل نہیں

دل کی خلوت گاہ میں مسکن بنایا ہے ترا
اب حجاب و شرم کا پردہ کوئی حائل نہیں

گو رہینِ کامیابی ہے نہ مرہونِ مآل
غیر از لذت ہماری سعیِ لاحاصل نہیں

مجھ سے تو ملتے نہیں۔ ہے دل پہ ہر لحظہ نگاہ
یہ تو قابل ہے تمہارے۔ میں ہی کیا قابل نہیں

یاد رکھو تم کہوگے ایک دن حسرت کے ساتھ
اُٹھ گئے اوتار جب سے رونقِ محفل نہیں

(قطعہ)

غربت کدہ میں راحت و عیشِ وطن کہاں
اب تو قفس کی قید ہے سیرِ چمن کہاں

وقتِ سحر ہے لطفِ شبِ وصل کیلئے
جاتے ہو مجھ کو چھوڑ کے اے جانِ من کہاں

ایدلؔ تیرے جوشِ تصور کا ہے فریب
ورنہ ہمارے گھر میں وہ گل پیرہن کہاں

بھولی دیارِ غیر میں گویا زبان بھی
اوتار اب وہ شوخیٔ فکرِ سخن کہاں

بسمل ہوں میں وہ جذبۂ قاتل کو بدل دوں
تدبیر سے تقدیر کے حاصل کو بدل دوں

پھر تو بھی محبت میں گرفتار ہو میری
کاش ایسی بھی صورت ہو ترے دل کو بدل دوں

ہر گام پہ اُٹھیں جو قدم اور زیادہ
آسانی میں دشواریٔ منزل کو بدل دوں

ایسا ہوں سیاہ بخت جو پہنچوں بھی ہاں تک
امواجِ حوادث سے میں ساحل کو بدل دوں

پھر داغ جلیں اور ہو رقصِ دلِ بسمل
پھر رونق و آرائشِ محفل کو بدل دوں

کہتا ہے فلک دیکھ کے تیرا رخِ زیبا
بس میں ہو تو اس سے مہ کامل کو بدل دوں

دل اپنا بدل جائے ہے امکان سے باہر
اللہ دے مقدور ترے دل کو بدل دوں

اوتار محبت کا تقاضا تو یہی ہے
دل دوں جسے اس شوخ کے بھی دل کو بدل دوں

(۱۲۳) عجب انداز سے سیرِ گلستاں کر رہا ہوں میں
بہارِ زندگی وقفِ بیاباں کر رہا ہوں میں

مگر نسبت تو ہے کچھ ان کو بھی زلفِ پریشاں سے
وہ برہم ہو رہے ہیں. دل پریشاں کر رہا ہوں میں

سمجھتے ہیں غلط مفہوم مہر و مہ جہاں والے
یہ ہیں دو داغِ دل جن کو نمایاں کر رہا ہوں میں

اڑائیں دھجیاں جوشِ جنوں نے اس قدر اب کی
کہ ہر تارِ نظر صرفِ گریباں کر رہا ہوں میں

خدا کو یاد کرتا ہوں صنم کو دیکھ کر واعظ
بتوں کے عشق کو بھی جزوِ ایماں کر رہا ہوں میں

خیال آتا ہے اک صیاد کے دستِ حنائی کا
قفس میں بند رہ کر خونِ ارماں کر رہا ہوں میں

قیامت میں کیا ہے اس نے وعدہ مجھ سے ملنے کا
ابھی سے عرصۂ محشر کا ارماں کر رہا ہوں میں

تری ہر ہر ادا میں دیکھتا ہوں قدرتِ صانع
اب ان کافر نگاہوں کو مسلماں کر رہا ہوں میں

کمالِ آرزو سے مجھ کو کیا کیا ہو گیا حاصل

کہ ہر مشکل سی مشکل کو بھی آساں کر رہا ہوں میں

نہ کیوں اوتار منت کش رہوں حسنِ تصور کا
قفس میں ہوں اگر سیرِ گلستاں کر رہا ہوں میں

اوتار پھوٹ جائے جو تقدیر کیا کروں
تاثیر آشنا نہیں تدبیر کیا کروں

خود اپنے دل سے ہو گئی تقصیر کیا کروں
شکوہ ترا پھر اے بتِ بے پیر کیا کروں

کچھ مشغلہ بھی چاہیئے فرقت کی رات ہے
کھینچوں اگر نہ نالۂ شبگیر کیا کروں

اللہ رے رعبِ حُسن تری بزمِ ناز میں
خاموش ہوں میں صورتِ تصویر کیا کروں

اے جوشِ وحشت و بادیہ پیمائی۔ الوداع
وابستہ پاؤں سے ہوئی زنجیر کیا کروں

میں مبتلا ہوں گیسوئے پرخم کے عشق میں
سیدھی نہیں رہی مری تقدیر کیا کروں

یا دل شکستہ منزلِ مقصود بے نشاں
قسمت ہے نارسا کوئی تدبیر کیا کروں

اوتار جانتا ہوں کہ قسمت ہے نارسا
پھر بھی یہ سوچتا ہوں کہ تدبیر کیا کروں

(و)

(ایضاً)

دمِ زینت اگر آئینہ خود آرا لیلو — اپنا دِل آپ ہی تم عکس کے شیدا لیلو
تابِ نظّارہ نہ لائی جو نگاہِ عاشق — خاکِ پا دے کے کہا آنکھ کا سرمہ لیلو
جب کہا تیرگیٔ بخت کا اس نے گِلہ — رُخ دکھا کر یہ کہا ہم سے اجالا لیلو
میری توہین نہ اس بزم میں ہونے پائے — جام اس ہاتھ سے بھی ایک خدا را لیلو
نقد دل لیکے اگر لطف نہیں فرماتے — تو یہی کہہ دو کہ ہے مال تمہارا لیلو
نذرِ دِل کرنے کو آئی ہے چمن سے بلبل — اس کا نذرانہ بھی تم اے گلِ رعنا لیلو
کوئی بھی دوست نہیں آئیگا کام اے اوتار
پار ہونا ہے تو خالق کا سہارا لیلو

(۱۹۲۱ء)

صحنِ چمن ہو نگہتِ گل بے حساب ہو — جوشِ طرب سے ہاتھ میں جامِ شراب ہو
دل میں نہ کچھ خیالِ ثواب و عذاب ہو — ناصح کوئی نہ ہو نہ کوئی شیخ و شاب ہو
حائل کوئی نہ پردۂ شرم و حجاب ہو
ہم ہوں صنم ہو اور شبِ ماہتاب ہو
گردن میں ہاتھ ڈالکے وہ شوخ مہ جبیں — یوں مسکرا کے ناز سے بولے نہ ہو حزیں
تو ہے صنم پرست تو میں شاہد حسیں — موقع نہیں ملیگا کبھی اس سے بہتریں
حائل کوئی نہ پردۂ شرم و حجاب ہو

جب میں ہوں تم ہو اور شبِ ماہتاب ہو

میں یہ کہوں کہ اے بتِ خوش چشم و خوش ادا  جو کچھ کہا ہے تو نے کہا ہے بہت بجا
کہتے ہیں تجھ کو حسن کی دنیا میں دل ربا  ٹھہر گیا تیرے سامنے کیا زہد پارسا

حائل کوئی نہ پردۂ شرم و حجاب ہو
بس میں ہوں تم ہو اور شبِ ماہتاب ہو

اب آرزو یہی ہے کہ اک ایسا یار ہو  میں اس کو چاہتا ہوں اسی مجھ سے پیار ہو
ہو رنج دور اور خوشی بیشمار ہو  پھر لطفِ زندگی کا ہو جوشِ بہار ہو

حائل کوئی نہ پردۂ شرم و حجاب ہو
اوتار ہو صنم ہو شبِ ماہتاب ہو

تشنہ لب کو آبِ جو کی آرزو  تیرے خنجر کو لہو کی آرزو
ہم کو تجھ سے خوبرو کی آرزو  بلبلوں کو رنگ و بو کی آرزو
روز و شب بے چین رکھتی ہے ہمیں  اک پری وش ماہرو کی آرزو
خانۂ دل اپنا کیوں روشن نہ ہو  ہم کو ہے اک شمع رو کی آرزو
طاقتِ نظارہ زائل ہو چکی  رہ گئی اب گفتگو کی آرزو
بزم سے ہم کو نکالا یار نے  ہو گئی پوری عدو کی آرزو
عشق کی دنیا میں اے ہمدم ہمیں  ہے دلِ بے آرزو کی آرزو
کیوں نہ ہوں اوتار ہم شعر گرم  مجھ کو ہے اک شعلہ رو کی آرزو

سنہ ۱۹۱۶ء
عابد وہ جس کو لطفِ عبادت نصیب ہے — عاشق وہ جسکو ذوقِ شہادت نصیب ہے
بیکار عمرِ خضر ہے ناکامِ عیش کو — زندہ وہی ہی جس کو مسرت نصیب ہے
دنیا کا سیم و زر بھی کیا جمع گر تو کیا — دولت کی قدر کچھ نہیں عزت نصیب ہے
بیحس انھیں سمجھئے جو ہیں ناشناسِ حسن — ہاں دل وہ دل ہے جسکو محبت نصیب ہے

عاصیِ بشر مسارتھا اور نار خندہ دل
رحمت خدا کی اس پہ ہو جنت نصیب ہے

سنہ ۱۹۲۰ء
کاش سمجھاتا کوئی ہمر مونس و غمخوار کو
مرگ ہی آکر شفا دے گی دلِ بیمار کو

کہہ رہے ہیں وہ کہ اب عرضِ تمنا کیجئے
دیکھ کر مفقود میری طاقتِ گفتار کو

ہیں دمِ فکرِ سخن کیا کیا خیالاتِ وسیع
خوب طولانیِ مضموں ہے نگر اوتار کو

سنہ ۱۹۲۰ء
جو دل ہوں پژمردہ پھر مسرت جہاں ہیں آشکار کیوں ہو
قفس میں ہوں بند جب عنادل تو باغ میں پھر بہار کیوں ہو

نہ ہو جو ذوقِ نظر میسر کسی کا دل بے قرار کیوں ہو
نہ شمع سان حسن جلوہ گر ہو تو عشق پروانہ وار کیوں ہو

نہ دل ہی سینے میں ہو تو ہمدم خلش ہو کیوں اضطرار کیوں ہو

کسی کے عشقِ جنوں اثر میں یہ پیرہن تار تار کیوں ہو
تڑپ تڑپ کر کسی کی فرقت میں حشر کا انتظار کیوں ہو
کسی کے وعدے کا تجدید کو اے دل شبِ الم اعتبار کیوں ہو
تو میرے عصیاں کی شرم رکھ لے بڑھا کے رحمت کی وسعتوں کو
ترے کرم کا حساب کیوں ہو مرے گنہ کا شمار کیوں ہو
ستم شعاری تمہارا شیوہ . ستم کشی ہے ہماری عادت
ستم کئے جاؤ بے تکلف . تم اس قدر شرمسار کیوں ہو
تمہاری آنکھوں کے مست جو ہیں غرض ہی کیا مے کشی سے ان کو
رہو یہیں تم جو لطف فرما تو کوئی پھر بادہ خوار کیوں ہو
نگاہِ ساقی ہے کیف افزا مجھے نہیں ہوش کی تمنا
ہو لطف جب بیخودی میں اتنا تو پھر ہوشیار کیوں ہو
رہے سلامت وہ دستِ نازک کمی ہو گی کبھی خلش میں
جو تیر چھوڑے وہ تیرِ افگن مرے کلیجے کے پار کیوں ہو
عبث اسے اُتار کر رہے ہو تم اپنی مجبوریوں کے شکوے
کسی کو جب دل ہی دے چکے ہو تو پھر تمہیں اختیار کیوں ہو
الٰہی دے ادائے لطف وزدیدہ نگاہی کو
نہیں تو ضبط کی ہمت ہو قلبِ مبتلا ہی کو

چمن میں جل رہا ہے آشیانہ ہائے مجبوری — قفس سے دیکھتا ہوں میں نشیمن کی تباہی کو
نہیں اے چارہ گر جب تو ہمارے درد سے واقف — تو کس برتے پہ آیا ہے ہماری خیر خواہی کو
سجوِ آسماں نے تو بہت تدبیر کی لیکن — نہ تھا ممکن مٹا دینا مقدر کی سیاہی کو
مرے جوشِ تصور نے مجھے دھوکے دیئے کیا کیا — میں چشمِ سرمگیں سمجھا شبِ غم کی سیاہی کو

ہمارا عشق اے اوتار گویا جزوِ ایماں ہے
بتوں کو دیکھ کر ہم یاد کرتے ہیں خدا ہی کو

امیدِ لطف نہ اندیشۂ زیاں مجھ کو — کیا ہے عشق نے بیگانۂ جہاں مجھ کو
جلا ہی ڈالے گی آہِ شرر فشاں مجھ کو — مٹا کے چھوڑے گی بیتابیِ فغاں مجھ کو
دیا ہے جوشِ محبت نے درسِ خاموشی — خجل نہ بزم میں کر چشمِ خونفشاں مجھ کو
رہِ طلب میں ہوں وہ رہروِ شکستہ پا — نظر نہ آئی کبھی گردِ کارواں مجھ کو
حریمِ دل میں ہے مسکن ترا یہ سنتا ہوں — الٹ کے پردہ دکھا جلوۂ نہاں مجھ کو
دیارِ غیر میں ہوں راز داں نہیں کوئی — خدا کرے نہ ملے کوئی مہرباں مجھ کو
گلہ ہے آبلہ پائی کو کوچہ گردی کا — لیے پھرے گی یہ قسمت کہاں کہاں مجھ کو
شبِ فراق میں موت آ گئی کہ جی اٹھا — پیامِ موت ہوا عیشِ جاوداں مجھ کو
جنابِ فضل کی نوازش ہے میری حالت پر — ملا کب ایسا کوئی اور مہرباں مجھ کو

مری نظر میں ہے اوتار ان کا حسنِ خیال
جو کچھ سمجھتے ہیں احباب قدر داں مجھ کو

اپریل ۲۲ء

قطرہ قطرہ میں نظر آیا ہے دریا مجھ کو
ذرہ ذرہ میں دکھائی دیا صحرا مجھ کو

ایک عالم میں کیا عشق نے رسوا مجھ کو
ہم نفس کاش نہ ملتا دلِ شیدا مجھ کو

نہ رہا اب کوئی تقدیر سے شکوا مجھ کو
راحتِ روح ہوئی ترکِ تمنّا مجھ کو

کیوں نہ مرغوب شبِ غم کا ہو نقشا مجھ کو
ہو گیا گیسوئے شب رنگ کا سودا مجھ کو

اب زیادہ نہ ستا او ستم آرا مجھ کو
آج بے پردہ دکھا دے رُخِ زیبا مجھ کو

طور پر حضرتِ موسیٰ رہے محروم نظر
ذرہ ذرہ میں نظر آیا ہے جلوا مجھ کو

میں سمجھتا تھا کہ ساتھی ہیں ہمیشہ کیلئے
چل دیئے چھوڑ کے سب قبر میں تنہا مجھ کو

ساری دنیا کرے اوتار بتوں کو سجدے
اپنے اللہ کا ہے اب تو سہارا مجھ کو

۲۳ مئی ۱۹ء

نا مہرباں ہوئے کیوں۔ کیوں ہم سے بدگماں ہو
منظور گر یہی ہے کچھ اور امتحاں ہو

تیری ستم شعاری کچھ کم نہیں ہے ظالم
ہم سے ستم زدوں کا کیوں دشمن آسماں ہو

آرام سے بسر ہو کیا زندگی چمن میں
صیّاد کی نگہ میں ہر دم جب آشیاں ہو

کرنا عبث ہے شکوہ مجبوریوں کا اُن سے
جب دل ہی دے چکے ہم کیوں نالہ و فغاں ہو

میں بندۂ وفا ہوں بس آرزو یہی ہے
سجدے میں یہ جبیں ہو اور تیرا آستاں ہو

اس قرب پر تمہارا ہم سے عبث ہے پردہ
دل میں سما چکے ہو نظروں سے کیوں نہاں ہو

محرم کریگا رسوا تجھ کو جہاں میں اے دل
اس سے یہی ہے بہتر کوئی نہ رازداں ہو

اوتار کی دعا ہے قائم رہے یہ جلسہ
ہر اک شریکِ بزمِ اربابِ خوش بیاں ہو

بڑھایا گریۂ پیہم نے اپنے اور بھی غم کو
مصیبت میں مجھے ڈالا کہوں کیا چشمِ پرنم کو

سجودِ آستاں ہی گو منقش ہے جبیں اپنی
ستم ہے اس پہ بھی کہتا ہے وہ نا آشنا ہم کو

نہ کر مایوس اک مشتاق کو تو اے اجل آجا
بصد ناز و نزاکت آرہا ہے کوئی ماتم کو

شبِ وعدہ نہ ہوتی صرفِ آرائش تو کیا ہوتا
دمِ زینت نہ سلجھاتا اگر تو زلفِ پرخم کو

سناؤ داستانِ دردِ غم اوتار ہو وارفتہ ؛ تسلی دو اسی تدبیر سے تم اپنے ہمدم کو

شاید سکوں ہو قلب سے دور اضطراب ہو
بیمارِ غم کو نیند میسّر تو خواب ہو

ساقی ہو بزمِ ناز ہو جامِ شراب ہو
پھر کیوں نہ صدقے جان سے سو سو شباب ہو

شمس و قمر کریں تو کریں بے حجابیاں
وہ حُسن پُر حجاب ہے کیوں بے نقاب ہو

اقرار گر نہیں ہے تو انکار ہی سہی
لیکن مرے سوال کا کچھ تو جواب ہو

اے رحمتِ تمام کرم جب ہے بیشمار
ناحق مرے گناہ کا پھر کیوں حساب ہو

گو بھی ہے انتظارِ شراب طہور کا
لیکن کسی کی تشنگی کو اتنی تاب ہو

وہ حُسن کیا کہ جس کو نہیں عشق سے لگاؤ
وہ عشق کیا جو حسن سے ناکامیاب ہو

پیامِ مرگ سمجھا ہوں شبابِ یار پُر فن کو
کہ جس نے کر دیا برباد میرے دِل کے خرمن کو

ستم ہے تیری زلفوں کا ترے رُخ پر بکھر جانا

ہٹا دے زلفِ شبگوں کو دکھا دے روئے روشن کو

جوابِ خط نہ دیتا تو بھی اچھا تھا اے ہمدم
بنا کر نامہ بر بھیجا ہے اُس نے میرے دشمن کو

بہار آنے سے کیا حاصل قفس میں بند ہیں جب تک
نہ ہوں جب ہم ہی گلشن میں لگے آگ ایسے گلشن کو

زبردستی جو چھینا ہو تو دعویٰ بھی کرے کوئی
خود اس کو دل دیا ہم نے کہیں کیا ایسے رہزن کو

گلستاں میں نشاں ہی چھوڑ دے اے باغباں میرا
مٹا دے مجھ کو لیکن کیوں مٹاتا ہے نشیمن کو

تڑپنے میں کہیں بسمل نہ چھینٹے خون کے ڈالے
چھری تو پھیر گردن پر بچا کر اپنے دامن کو

زباں ہے ساحری فن اور سخن جادو بھرا تیرا
نہیں پہنچا کوئی اوتار تیرے طرزِ گفتن کو

اپنا دلِ مستانہ اب غم سے ہے بیگانہ
دیوانے کا دیوانہ - فرزانے کا فرزانہ
پُر شوق نظر اب تو کر جرأتِ مردانہ

تکمیلِ تمنا ہے وہ جلوۂ جانانہ

امید بر آئے گی اے برق تری کیونکر
ہم پھونک کے رکھ دینگے پہلے ہی سے کاشانہ

دربارِ محبت میں یوں اہلِ وفا پہنچے
دامانِ تمنا میں اشکوں کا تھا نذرانہ

کم ظرفیوں پر تیری آتی ہے ہنسی ساقی
پی لیتے جو دے دیتا میخانے کا میخانہ

جامِ مے کوثر کی تجھ کو ہے ہوس زاہد
آ محفلِ رنداں میں۔ لے ہاتھ میں پیمانہ

حالت دلِ مضطر کی کیا ہے مرے پہلو میں
کیا تجھ کو کہوں ہمدم۔ افسانہ در افسانہ

ہے عشقِ بتاں دل میں۔ اللہ کا گھر دل ہے
کعبہ میں نظر آیا ہر سمت صنم خانہ

اوتار کی باتوں کو کب خلق سمجھتی ہے ؟
دل اس کا فقیرانہ اور وضع امیرانہ

دمِ بسمل نکلتا ہے مگر آہستہ آہستہ
چھری چلتی ہے لیکن کس قدر آہستہ آہستہ

نہیں مجھکو اجازت سنگِ در پر بیٹھنے کی بھی
یہ خطرہ ہے بنا لوں گا میں گھر آہستہ آہستہ

ضرور آئیگا وہ جانِ تمنا میرے گھر اے دل
کریگا جذبۂ الفت اثر آہستہ آہستہ

نکالا جا رہا ہوں بزمِ جاناں سے بمجبوری — قدم اٹھتا ہے اپنا کس قدر آہستہ آہستہ

بہت پر خار ہے افگار دنیائے محبت ہو
اٹھا اپنا قدم وقتِ سفر آہستہ آہستہ

(ی)

دور ہی دور سے او چھپ کے گذرنے والے
یاد ہے یاد ہے کچھ کہہ کے مکرنے والے

دامنِ صبر و شکیبائی کُترنے والے
سن تو لے بات ذرا بات نہ کرنے والے

صبح کو شام سے تبدیل ہیں کرنے والے
رُخِ انور پہ ہیں اب بال بکھرنے والے

جب کہا میں نے کہ مرتا ہوں تو ہنس کر بولے
ہم نے دیکھے ہیں بہت آپ سے مرنے والے

ہو کے شمشیر بکف ناز سے قاتل نے کہا
دم محبت کا مری کون ہیں بھرنے والے

ہم ازل ہی سے ہیں سرشارِ جنابِ افگار
نشے کب مہر و وفا کے ہیں اترنے والے

ساقیٔ رعنا ہے دورِ جام ہے — مست ہر اک رند مے آشام ہے
رُخ پہ ان کے زلفِ عنبر فام ہے — صبح پیچھے آگے آگے شام ہے

توبہ توبہ اب نہیں توبہ کی خیر
دستِ نازک میں کسی کے جام ہے

عشق کہتی ہے جسے خلقِ خدا
حسن کا وہ دوسرا اک نام ہے

جیتے جی تھیں زندگی کی تہمتیں
ہم پہ مرجانے کا اب الزام ہے

ہر جگہ ہے حسنِ رعنا آشکار
پھر بھی اس سے عشق تشنہ کام ہے

آفتابِ زندگانی ڈھل گیا
عہدِ پیری زندگی کی شام ہے

بیقرارِ عشق دلبر کے لئے
آمدِ شب موت کا پیغام ہے

ہم کو آتی ہے عدم سے یہ صدا
زندگی سے موت میں آرام ہے

ہے نظر ہی تیری ناقص ورنہ وہ
جلوہ بخشِ بزمِ خاص و عام ہے

مدعا بر آئے اپنا کس طرح
سعی لاحاصل بغیر انجام ہے

لوگ کہتے ہیں جسے اوتار کرشن
آپ کا ہی بندۂ بے دام ہے

جانتے ہیں خوب ہم اوتار کو
آدمی اچھا مگر بدنام ہے

طبیعت بھی آخر بہل جائیگی
سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی

کبھی آہ بن کر کبھی اُف کے ساتھ
مری آرزو بھی نہ نکل جائیگی

کروں ضبط فریاد ممکن یہ ہے
مگر آہ دل سے نکل جائیگی

جو وہ حسنِ دلسوز عریاں ہوا
تو پھر رشک سے شمع جل جائیگی

نکالیں گے ہم کو وہ خود بزم سے
رقیبوں کی یوں چال چل جائیگی

جہاں خوبرویوں کو دیکھیں گے ہم — طبیعت ہماری مچل جائیگی
ہوئے داخلِ حلقۂ اصنام گر — طبیعت ہماری بہل جائیگی
شبِ ہجر ممکن نہیں موت بھی — جو آئی بھی ہو گی تو ٹل جائیگی

نہیں ایک سے رہتے اوتار دن
تمہاری بھی قسمت بدل جائیگی

(۱۹۲۴ء)

سواری ہے کس شوخِ ذی جاہ کی — اُٹھی گرد تعظیم کو راہ کی
غمِ عشق نے دل میں جب راہ کی — کبھی ہم نے نالہ کبھی آہ کی
کیا قتل تیغِ ستم سے مجھے — فقط جرم یہ تھا تری چاہ کی
ہے داغوں سے دل میرا رشکِ ارم — محبت میں اس غیرتِ ماہ کی
عبث عرضِ احوال کرتے رہے — ذرا بھی نہ اس بت نے پرواہ کی

ہے اوتار سرشار مستِ سخن
طلب اس کو ہرگز نہیں واہ کی

(۱۹۲۶ء)

کیا صورتیں بنائی ہیں پروردگار نے
جلوے دکھائے حُسنِ کرشمہ شعار نے

بتلا دیا یہ گردشِ لیل و نہار نے
کچھ دن ہیں زندگی کے ہمیں بھی گذارنے

رنگیں کیا قفس کو دلِ بے قرار نے

یہ اور گل کھلا دیا فصلِ بہار نے

سینہ میں پہلے رکھ دیا الفت پذیر دل
پھر اس میں درد بھر دیا پروردگار نے

ہو اس قدر تو جذبۂ الفت میں بھی اثر
خنجر بکف وہ آئیں مرا سر اتار نے

کن حسرتوں سے توڑا ہے دم بیکسی کے ساتھ
منزل سے دور ایک غریب الدیار نے

خود وقفِ عشق ہو کے ہوا صرفِ حسنِ شوخ
درسِ فنا دیا دلِ الفت شعار نے

آوتار خستہ حال کی حالت نہ پوچھئے
مارا غریب کو ستمِ روزگار نے

حقدار تری رحمت کا وہی اے ربِّ دو عالم ہوتا ہے
جو اپنے اشکِ ندامت سے ہر داغِ معاصی دھوتا ہے

کیوں غرقِ تمنا ہوتا ہے کیوں اپنی ناؤ ڈبوتا ہے
کیوں مفت میں جان گنواتا ہے کیوں ہاتھ سے دل کو کھوتا ہے

پھر ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے پھر درد سا پیدا ہوتا ہے
پھر یاد تری تڑپاتی ہے پھر ہجر میں کوئی روتا ہے

جو ہنستا ہے اُسے ہنسنے دو۔ جو روتا ہے اسے رونے دو
دستور یہی ہے دُنیا کا۔ کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے

تدبیر کرو۔ کوشش بھی کرو۔ جو کچھ بھی ہو بس میں وہ کرو
سو بات کی ہے اک بات یہی جو ہونا ہے وہ ہوتا ہے

جب رات کو تارے گن گن کر فریاد و فغاں ہم کرتے ہیں
آرام سے بستر راحت پر وہ میٹھی نیند میں سوتا ہے

کچھ ضبط کرو۔ کچھ صبر کرو۔ تدبیر کرو ناداں نہ بنو
اوتارؔ تمہیں سمجھاتے ہیں ہم رونے سے کیا ہوتا ہے

جب برابر کی چاہ ہوتی ہے — دل کو پھر دل سے راہ ہوتی ہے
ان کی برہم نگاہ ہوتی ہے — زندگی اب تباہ ہوتی ہے
یہ نشانی ہے تیرے عاشق کی — لب پہ ہر وقت آہ ہوتی ہے
ان حسینوں کو عاشقوں سے بھی — دشمنی بے پناہ ہوتی ہے
رشک، ان کو کہہ نہیں سکتا — حور بھی رشکِ ماہ ہوتی ہے

شعر پڑھتے ہیں آپ جب اوتارؔ
بزم میں واہ واہ ہوتی ہے

محبت کا الٹا اثر دیکھئے — وہ جلتے ہیں دشمن کے گھر دیکھئے

مرے سوزِ غم کا اثر دیکھئے — وہ میت پہ ہیں جا وہ گر دیکھئے
جدھر ان کا نیزِ نظر دیکھئے — اُدھر ٹکڑے ٹکڑے جگر دیکھئے
شبِ ہجر میں ہے یہی اک امید — کہ آتا ہے کب نامہ بر دیکھئے
کوئی زلف بر دوش ہے بام پر — اندھیرے میں نکلا قمر دیکھئے
کسی کی انھیں ہے مگر جستجو — ہیں گردش میں شمس و قمر دیکھئے
کمالِ تصور ہے یہ عشق کا — وہی سامنے ہیں جدھر دیکھئے
گلستاں کے پھولوں میں رکھا ہی کیا — مرے داغہائے جگر دیکھئے

فقط ایک مرنا ہی باقی رہا
عمل یہ بھی اختیار کر دیکھئے

جاوہ فگن ہے شاہدِ رعنا کہیں جسے — اہلِ نگاہ دل کی تمنا کہیں جسے
وہ کام ہی نہ کیجئے بیجا کہیں جسے — وہ بات ننگِ عشق ہی شکوہ کہیں جسے
ہم اس کو کیا کریں ستم آرا کہیں جسے — اُسکی طلب ہے جان سے پیارا کہیں جسے
اپنی نگاہ طالبِ حسنِ لطیف ہے — دل میں جگہ ہے اسکی دل آرا کہیں جسے
اے حسنِ عرش تاب کیسا حجاب ہے — وہ شمع بن کہ انجمن آرا کہیں جسے
اے شوخ میرے اشکِ تمنا کی قدر کر — یہ وہ گہر ہے آنکھ کا تارا کہیں جسے
کشتیٔ عمر بحرِ حوادث میں ہے رواں — اور مرگ وہ ہے اس کا کنارا کہیں جسے
اُٹھ جائے یہ تو دیکھ لیں وہ جلوۂ لطیف — غفلت نے ڈال رکھا ہی پردہ کہیں جسے

اوتار دوست نام کے دنیا میں ہیں بہت
ایسا مگر کوئی نہیں پایا کہیں جسے

(غزل)

ازل سے مرے دل میں نقشِ صنم ہے — یہی غیرتِ ماہ رشکِ ارم ہے
نہیں رند سے مے پرستی میں کم ہے — وہ کوثر کا طالب جو شیخِ حرم ہے
ضیائے قمر میری نظروں میں پھیکی — ترے ہی رخِ پُر ضیا کی قسم ہے
کبھی آ کے تم اسکی زینت بڑھاؤ — مرا دل بھی داغوں سے رشکِ ارم ہے
نہیں مجھ کو مطلوب عیشِ دو عالم — دیا درد تو نے یہ تیرا کرم ہے
رہے خوش وہ جس نے ستایا ہے دل کو — دعا اک یہی اب مری دم بدم ہے
کروں حالِ دل اس پہ کیونکر میں ظاہر — نہ تابِ بیاں ہے نہ تابِ رقم ہے
شبِ غم کی مجبوریاں تم نہ پوچھو — فغاں بے اثر ہر نفس پُر الم ہے
مصیبت کی ہے کاٹنی رات مشکل — ابھی اے دلِ زار شامِ الم ہے
تری زلف کا جوڑ عاشق کی قسمت — وہی تیرگی ہے وہی پیچ و خم ہے
الٹ کر نقاب اپنا جلوہ دکھا دو — مریضِ محبت کی آنکھوں میں دم ہے
ادھر جو گیا پھر وہ واپس نہ آیا — خدا جانے کیا رازِ ملکِ عدم ہے

کہے ہیں جو اوتار اشعار دلکش
یہ جوشِ طبیعت ہے زورِ قلم ہے

(غزل)

حسنِ خوباں میں جھلکتی ہے صنعت تیری

اے خدا ان کی پرستش ہی عبادت تیری

دل میں گھر کر گئی اے یار محبت تیری
بس گئی چشمِ تمنا میں بھی صورت تیری

سخت پتھر تھی اگر دیر میں مورت تیری
گل کے پردے میں بھی دیکھی ہے نزاکت تیری

جذبۂ عشق کا ہے جوشِ تصور یعنی
دل کے آئینے میں کھنچ آئی ہے صورت تیری

حسن خود بیں کو کیا جذبِ دلِ عاشق نے
ذرہ ذرہ میں نظر آئی ہی صورت تیری

دعوئ زہد لئے بیٹھے رہے سب زاہد
کام آئی تو گنہگار کے رحمت تیری

دیکھ کر تجھ کو کئے ہم نے حرم میں سجدے
بتکدہ میں بھی جو پوجی ہے تو مورت تیری

حسنِ دل کش نے کیا عشق جہاں میں پیدا
ہوگئی عشقِ جنوں ساز سے شہرت تیری

تو تو وہ ہے کہ جسے پیار ہر اک کرتا ہے
کب کہا ہم نے نہیں غیر کو الفت تیری

اب تو دو گھونٹ ہمیں لطف سے پی لینے دے
کہہ چکا بس چکے اے شیخ نصیحت تیری

غیب سے دل میں مضامین اتر آتے ہیں
مجھ میں توفیق کہاں تھی یہ ہے رحمت تیری

کیوں نہ صد چاک کرے غیر کا دل اے اوتار
یہ بلاغت یہ فصاحت یہ سلاست تیری

آفت آئی ہوئی سر پر ہو تو ٹل جاتی ہے
یا تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے

ہیں جو کوتاہ نظر اس کو فنا کہتے ہیں
جسم خاکی سے فقط روح نکل جاتی ہے

درد پھر اٹھتا ہے پھر یاد تجھے کرتا ہوں
جب طبیعت مری فرقت میں سنبھل جاتی ہے

خوبرویوں میں خدا جانے ہے کیسا افسوں
دیکھ کر ان کو طبیعت بھی مچل جاتی ہے

بس کی یہ بات نہیں عشق پہ کچھ زور نہیں
ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے

کب ملی کس کو ملی ہے مئے الہڑ دا

کیا طبیعت مری باتوں سے بہل جاتی ہے

نیند بھی آتی نہیں وہ بھی نہیں آ سکتے
چھوڑ کر یوں مرے بالیں سے اجل جاتی ہے

سچ ہے یہ قول کسی اہلِ خرد کا اے اوتارؔ
جب برے دن ہوں تو قسمت بھی بدل جاتی ہے

غیر کا آج سے وہ دشمنِ جاں ہوتا ہے
نفسِ سرد مرا شعلہ فشاں ہوتا ہے

دیکھ سکتے نہیں محسوس تجھے کرتے ہیں
صورتِ نکہتِ گل سب پہ عیاں ہوتا ہے

خوگرِ ضبط ازل سے ہیں اسیرانِ قفس
نوگرفتار کو ہاں شوقِ فغاں ہوتا ہے

ہائے اس بزم میں خاموش رہوں میں کب تک
عشقِ پنہاں کا انھیں اب تو گماں ہوتا ہے

کب کہا ہم نے نہیں ہند میں اربابِ کمال
اپنا اپنا مگر اندازِ بیاں ہوتا ہے

شاعری کے لئے تخصیص یہ ہے اے اوتارؔ
عہدِ پیری ہو مگر شوق جواں ہوتا ہے

[illegible]

نام وہ مشہور اپنا کر گئے — انتہائے عشق میں جو مر گئے
ان کو بھائی میرے داغوں کی بہار — آہ سوزاں سے مگر وہ ڈر گئے
اشک باری چشمِ تر کی دیکھنا — دہر کے ساتوں سمندر بھر گئے
شوقِ سجدہ پھر بھی لایا کھینچ کر — ہم ہزاروں بار اس در پر گئے
جورِ درباں سے رہے محروم دید — آستانِ یار تک اکثر گئے
خانۂ دل میں نظر آیا کوئی — مفت کعبہ تک پھرے مندر گئے
لیکے جنت آئے اپنے ساتھ وہ — حشر برپا ہو گیا جب گھر گئے

عمر سب اوتارؔ کھوئی عشق میں
ہم کو کیا کرنا تھا اور کیا کر گئے

[illegible]

مر کے عمرِ جاودانی مل گئی — مستقل اب زندگانی مل گئی
داغِ الفت ہو گیا دل میں عیاں — عشقِ کامل کی نشانی مل گئی
عشق میں جو ہو گیا اندر فنا — اس کو عمرِ جاودانی مل گئی
دیدۂ تر سے ہوا حاصل سکوں — اشکِ غم کو جب روانی مل گئی
سرگذشتِ غم کہی دل کھول کر — جی بہلنے کو کہانی مل گئی
اس ستمگر کو ستم کے واسطے — کس قیامت کی جوانی مل گئی

ہم کو بھی اوتارؔ دل کے لطف سے
شعر کی جادو بیانی مل گئی

یہ نہ تم سمجھو کہ ہم ٹالے سے ٹل جائینگے (١٩٢٧ء)
گھر سے نکلے بھی اگر در پہ مچل جائینگے

واعظو۔ ذکرِ مئے خلد عبث کرتے ہو
ہم کوئی شیخ نہیں ہیں جو بہل جائینگے

جانِ من تم نہ نکالو مرے دل کے ارماں
آہیں بن بن کے کبھی خود یہ نکل جائینگے

وہ نہیں ہم جو کریں تیرے ستم کا شکوہ
لب تک آئیگا تو کچھ کہہ کے بدل جائینگے

شبِ وعدہ جو سلجھ جائیں گے ان کے گیسو
میری تقدیر کے سب بل بھی نکل جائینگے

آپ مقتل میں پشیماں جو ہوئے جاتے ہیں
سر کہاں چھوڑنے مشتاق اجل جائینگے

آج کل حضرت اوتار ہیں بدمستِ شباب
دیکھئے گا کوئی دن میں یہ سنبھل جائینگے

تازہ ستم کی اور اک ایجاد ہو گئی (١٩٢٨ء)
شہرت تری جو بانیٔ بیداد ہو گئی

اک مہربان نے دستِ کرم جب اٹھا لیا
دنیا دلِ غریب کی برباد ہو گئی

اس بت کے عشق میں تو طبیعت کا حال ہے
مسرور ہو گئی کبھی ناشاد ہو گئی

قیدِ حیات میں تھی گرفتارِ اے اجل
تیرے کرم سے روح اب آزاد ہو گئی

میں ہوں وہ غم نصیب کہ جس کی تمام عمر
وقفِ فغان و نالہ و فریاد ہو گئی

گردش رہی جو زلفِ پریشاں کے عشق میں
مرنے کے بعد خاک بھی برباد ہو گئی

اوتار کو بھی صاحبِ دیواں بنا دیا
اس پر بڑی عنایت استاد ہو گئی

تاثیر ہی الٹی ہے کیا جذبۂ الفت کی
جس جس سے محبت تھی اس اس نے عداوت کی

میں ہجر میں رو رو کر گنتا ہی رہا تارے
کٹتی نہیں کاٹے سے گھڑیاں شبِ فرقت کی

بن بن کے مہ و انجم گردوں پہ چمک جاتے
تو قیر جو وہ کرتے ہر اشکِ ندامت کی

کیوں ملنے کو ہم جائیں کیوں ملنے کو وہ آئیں
یہ آن ہے الفت کی وہ شان نزاکت کی

ہے دشمنِ جان و دل۔ دل جس کو دیا تم نے
کیا قدر کرے گا وہ اوتار محبت کی

تو پردۂ راز میں نہاں ہے
جلوہ ترا چار سو عیاں ہے

میں ڈھونڈ رہا ہوں تو کہاں ہے
نظروں سے نہاں ترا نشاں ہے

صیاد کا دام آشیاں ہے
صیاد بھی مجھ پہ مہرباں ہے
گلزار میں تھا کبھی نشیمن
اب تو یہ قفس ہی آشیاں ہے
اک عمر سے قسمت آزما ہوں
سر میرا ہے تیرا آستاں ہے
اوتار بھی ہے تیرہ بختی
تقدیر سے تو جو بدگماں ہے

الفت کدہ میں دل کے محبت کا جوش ہے ۲۲۴
میرا کلام اس لئے مقبولِ گوش ہے

بے پردہ بزمِ ناز میں وہ پردہ پوش ہے
اے اہلِ بزم رخصتِ تمکین و ہوش ہے
پیغامِ وصل سننے کے ہیں کان منتظر
یہ چشمِ انتظار بھی نظارہ کوش ہے

الفت پرست میں ہوں وہ کافر ادا پرست
میں دلفروش ہوں تو وہ جلوہ فروش ہے
بجلی گری چمن میں یہ کہتا ہے باغباں
خانہ خراب آج سے خانہ بدوش ہے

اپنی خبر نہیں ہے مجھے اضطراب میں
نا آشنائے ہوش ہوں اتنا ہی ہوش ہے

منت پذیرِ چشم نہیں جلوۂ صنم
کب مژدۂ وصال طلبگارِ گوش ہے

میرا کلام سن کے وہ کہتے ہیں بزم میں
انسانِ با مذاق مگر بادہ نوش ہے

اسرارِ غیب ہے جو زباں سے نکل گیا
اوتار کا کلام کلامِ سروش ہے

اٹھے سیاہ گھٹا جھومتی بہار آئے
کہ بزمِ ساقیِ رعنا میں بادہ خوار آئے

نہ رہ سکے پسِ پردہ نگاہِ شوق ہو وہ
کسی کی چشمِ تصور میں بار بار آئے

شبِ فراق میں اختر شماریاں کیوں ہوں
کسی کے وعدے کا کیوں ہم کو اعتبار آئے

شبِ فراق میں جلتا رہا جو صورتِ شمع
خدا کرے کہ اسے قبر میں قرار آئے

جو دل ہو غمزدہ سامان نشاط کے کیوں ہوں
قفس میں بند ہوں جب ہم تو کیوں بہار آئے

نہ آئیں وہ شبِ وعدہ بھی جبکہ اے اوتار
تمہیں بتاؤ ہمیں کسطرح قرار آئے

دوستی دشمن سے کیسا عقل کا یہ پھیر ہے
جی جلائے جو اسی سے پیار کیا اندھیر ہے

جستجوئے عیشِ باطن ہو مبارک غیر کو
ہم ہیں قانع ابتدا سے ہی طبیعت سیر ہے

آدمی کا مرتبہ بالا ہے اسکی عقل سے
زور و طاقت میں تو ورنہ سب سے بڑھ کر شیر ہے

باہمی الفت کے مٹ جانے سے یہ حاصل ہوا
ایک ہنگامہ بپا دنیا زبر اور زیر ہے

راہ تکتا ہی تری مدت سے یہ غم خوار زار
اے اجل آنے میں تیرے جانے اب کیا دیر ہے

۱۹۲۶ء
بڑا احسان تیرا مجھ پہ اے جلاد ہو جائے — جو دامِ زندگی سے مرغِ روح آزاد ہو جائے
یہ دعویٰ ہی ہمارا اے ستمگر تو جو چاہے کر — یہ نا ممکن ہی لیکن وا لبِ فریاد ہو جائے
تم اپنے عاشقِ جانباز پر کیوں لطف فرماؤ — تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی برباد ہو جائے
نہیں ہم پر نگاہِ لطف اس کا غم نہیں ہم کو — کوئی تازہ ستم ہی اے ستم ایجاد ہو جائے
بہت مدت سی تیرا حال اے غمخوار خستہ ہی
خدا وہ دن بھی لائے جب کہ تو بھی شاد ہو جائے

۱۹۲۹ء
دوست ہم جسکو سمجھتے تھے وہ دشمن نکلا — رہ نما جسکو سمجھتے تھے وہ رہزن نکلا
نقشِ اصنام سی دل میرا مزین نکلا — دیکھو اللہ کے گھر میں بھی برہمن نکلا
ناز کس بات پہ کرتے ہو تم اے شمس و قمر — تم سے تو دل کا مرے داغ ہی روشن نکلا
ہم گرفتار ہوئے بھی تو سمجھتے ہیں یہی — آج صیاد کے شانوں پہ نشیمن نکلا
سرنگوں کس کی ہیں تعظیم میں یہ شمس و قمر — جس کو بھی دیکھا جھکائے ہوئے گردن نکلا
سینہ جب ہو گیا شق سوزِ دروں سے میرا — دل کا ہر داغ مرے غیرتِ گلشن نکلا
جب قناعت کا سبق سیکھ لیا اے غمخوار
جس کو ہم دانہ سمجھتے تھے وہ خرمن نکلا

۱۹۳۰ء
نوا سنجانِ گلشن بھی سمجھتے ہیں زباں میری

عنادل کو بھی ہے منظور تقلیدِ فغاں میری

مہِ کامل میں داغِ دل کا عالم ہو نہیں سکتا
تپش پائے یہ ممکن ہی نہیں برقِ تپاں میری

غلط فہمی انکی جو ستائے ان کو کہتے ہیں
چمکتی ہیں فلک پر آہ کی چنگاریاں میری

مجھے غربت میں اندیشہ نہیں ہے راز کھلنے کا
دیارِ غیر میں سمجھے گا کوئی کیا زباں میری

تمنا ہے کہ دل بنجائے کاشانہ محبت کا
جبیں ہوتی رہے صرفِ سجودِ آستاں میری

ریاضِ دہرِ فانی میں وہ ناکامِ تنہا ہوں
حیاتِ چند روزہ ہو گئی صرفِ فغاں میری

دلِ ناکام کی حالت پہ شاید رحم آجاتا
وہ سنتا ہی نہیں اوتار لیکن داستاں میری

کیوں پریشان ہو تم اس بتِ پُرفن کے لئے
جان اوتارؔ نہ دو جان کے دشمن کے لئے

مسجدوں میں بھی رہا سر مرا وقفِ سجدہ
مندروں میں بھی پھرا یار کے درشن کے لئے

نہ ملا دیر میں کعبہ میں نہ پایا اس کو
لطف مخصوص تھا یہ فلک کے رہزن کیلئے

کم نہیں اپنی ہی آہوں کی شرر افشانی
بجلیاں کیوں گریں بربادیِ خرمن کیلئے

میرے صیاد نے تیار کیا ان سے قفس
تیلیاں چمن کے جو لایا تھا نشیمن کیلئے

جب سمجھنے لگے صیاد کو ہمدرد اپنا
پھر قفس میں بھی مزے ہیں نشیمن کیلئے

زلف گالوں سے ہٹی چاند گہن سے چھوٹا
ہم نے اس صدقے میں بوسے رُخ روشن کیلئے

آرزو دید کی رہ جائے گی وقت آخر
وہ چھری تیز کریں گے مری گردن کیلئے

ہیں وہ ناکامِ تمنا چمن دہر میں ہوں
پھول بھی خار بنے جاتے ہیں دامن کیلئے

اب خزاں آئی تو کیوں روتے ہیں ہم اوتار
موسمِ گل میں مزے آپ نے گلشن کے لئے

آج ان آنکھوں سے دریا بہ گئے — اس مصیبت پر بھی جیتے رہ گئے

کچھ نہ سمجھا کوئی گو ہم غم نصیب
داستانِ عشق ساری کہہ گئے

وہ مسافر قابلِ افسوس ہیں
پہلی منزل میں جو تھک کر رہ گئے

مکتبِ الفت میں پایا درسِ ضبط
جب پڑی کوئی مصیبت سہہ گئے

ہو گئے وارفتہ رعبِ حسن سے
ہم کو کچھ کہنا تھا اور کچھ کہہ گئے

مل گیا جامِ تمنا غیر کو
حضرتِ آقتار بیٹھے رہ گئے

مے وحدت کو پی کر ہوش میں دیوانہ آتا ہے ۱۹۶۴ء
شرابِ شوق سے سرشار اک مستانہ آتا ہے

پری رویوں کی محفل میں دلِ دیوانہ آتا ہے
جہاں پر شمع ہوتی ہے وہیں پروانہ آتا ہے

نہیں منظور قدرت کو جو توبہ توڑنی میری
تو بادل جھوم کر کیوں جانبِ میخانہ آتا ہے

نگاہیں رقص کرتی ہیں ہر اک کی ساقیِ محفل
تری تحریک سے گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

غرض کیا ہے مجھے کیوں جانبِ دیر و حرم جاؤں
نظر چاروں طرف جب جلوۂ جانانہ آتا ہے

اسی کی ہے نگاہوں میں ادائے خنجرِ قاتل

کفن باندھے ہوئے سر سے جو بیتابانہ آتا ہے

یہ عالم ہے دلِ وارفتہ تیرے جوشِ وحشت کا
نظر ہر سو مجھے ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے

کیا عالم کو جس نے مست جامِ کیف پرور سے
وہی اوتار پیرِ مسلکِ رندانہ آتا ہے

غزل

ہو گئے عاشق شاہدِ گلفام کے — اب ہیں شکوے گردشِ ایام کے
غیر لے بوسے بتِ گلفام کے — ہم رہیں بیٹھے کلیجہ تھام کے
ذکر بھی اب بزم میں آتا نہیں — وہ تو دشمن ہیں ہمارے نام کے
ساقیِ محفل ادھر بھی اک نظر — منتظر ہم بھی ہیں تیرے جام کے
آ کے مدفن پر کہا اس شوخ نے — آپ بھی طالب ہوئے آرام کے
قتل کرتے ہیں وفا کے جرم پر — صدقے جاؤں شوخیِ الزام کے
تارِ دامان و گریباں لے جنوں — کام آئے عاشقِ ناکام کے
حضرتِ دل آج سنئے شوق سے — منتظر تھے آپ جس پیغام کے
ابر آیا جھومتی اٹھی گھٹا — بخت جاگے رندِ مے آشام کے
عاشقِ عارض ہوئے پابندِ زلف — صبح کو گھر آئے بھولے شام کے

سنتے ہیں اوتار عاشق ہو گئے
اک پری چہرہ بتِ گلفام کے

داغہائے قلبِ بسمل کا گلستاں دیکھئے
رنگِ گل کا دیکھنا کیا خونِ ارماں دیکھئے

وجہ رسوائی نہ ہو یہ آہِ سوزاں دیکھئے
کھل نہ جائے عشق کا اب رازِ پنہاں دیکھئے

پاؤں میں مہندی شبِ وعدہ لگائی آپ نے
ہو رہے ہیں آج کیا کیا خونِ ارماں دیکھئے

قلبِ مضطر کا بھی منظر رقص کچھ کم نہیں
چیر کر پہلو مری جاں دل کے ارماں دیکھئے

دیکھتے ہیں برق و باراں کا تماشا آپ کیوں
آہِ سوزاں دیکھئے اور چشمِ گریاں دیکھئے

قدرتِ صانع نظر آتی ہے اُن کے حُسن میں
ہو گیا عشقِ بتاں بھی جزوِ ایماں دیکھئے

حُسن پوشیدہ رہے منظور فطرت کو نہیں
آسماں پر ماہ بھی نکلا ہے عریاں دیکھئے

دشمنِ جاں ہو وہ بت غارتگرِ ایماں بھی ہے
بندۂ گیسو ہوئے لاکھوں مسلماں دیکھئے

حضرتِ وفاؔ اب چشمِ حقیقت کھول کر
ذرہ ذرہ میں نمایاں حُسنِ جاناں دیکھئے

(۱۹۲۰ء)

اک غزل دلکش سرِ محفل سنانی چاہیے
نکتہ سنجانِ سخن کی قدردانی چاہیے

اس بتِ سفاک کی ہمت بڑھانی چاہیے
اب سرِ مقتل ہمیں گردن جھکانی چاہیے

آنکھ اُس جادو نظر سے پھر لڑانی چاہیے
مشورہ دل کا ہے قسمت آزمانی چاہیے

او بتِ بے مہر اتنی ہر دم آزاری نہ کر
کچھ عنایت کچھ کرم کچھ مہربانی چاہیے

دخترِ رز کی چاہ اے رندو کبھی چھٹتی نہیں
یہ وہ کافر ہے نہ ہرگز منہ لگانی چاہیے

جو وفا سے بے خبر ہے عشق سے ناآشنا
سرگذشتِ دل اُسے کیوں کر سنانی چاہیے

شمع پر جل کر ہوئے قربان پروانے تو کیا
عشقِ کامل کے لئے سوزِ نہانی چاہیے

عمر دو روزہ میں درسِ عشق کیا لے گا کوئی
اس کے طالب کو حیاتِ جاودانی چاہیے

ابر اٹھا جھوم کر زاہد شریکِ بزم ہو

ساقیا اب تو شرابِ ارغوانی چاہیے

مردہ دل کی زندگی پر موت کو ترجیح ہے
زندگی کے ساتھ کیفِ زندگانی چاہیے

شاعری مشکل نہیں اہلِ زباں کے واسطے
ذوقِ کامل ہو طبیعت میں روانی چاہیے

قافیہ پیمائی اے اوتارؔ کچھ مشکل نہیں
شاعری کے واسطے جادو بیانی چاہیے

۱۹۳۳ء

کیوں گلا کرتا ہے قسمت میں اگر رونا ہے
دلِ ناکام وہی ہوتا ہے جو ہونا ہے

انکساری میں ہے دستورِ فلاحِ دارین
سرنگوں ہونا مرا سر بفلک ہونا ہے

اے اجل تجھ کو یہ تعجیل ہے کیوں صبر تو کر
بے کسی کو مرے بالیں پہ ابھی رونا ہے

مجھ سے کہتے ہیں کہ ہم خواب میں آ جائینگے
شبِ فرقت تری قسمت میں اگر سونا ہے

چشمِ شرمندہ سے چند اشکِ ندامت ٹپکیں
عاصیو داغِ گناہوں کا اگر دھونا ہے

شوق سے عشقِ بتاں حضرتِ اوتار کرو
آپ کو جان اگر دینی ہے دل کھونا ہے

وصل کی شب ہم بغل ہو کر وہ شرمانے لگے
عاشقِ حسرت زدہ کو اور تڑپانے لگے

بزمِ ساقی سے جو نکلے شیخ صاحب نامراد
ذکرِ حورِ خلد سے وہ دل کو بہلانے لگے

ہاں مدد تھوڑی سی کر اے ناخنِ دستِ جنوں
چارہ گر سمجھے ہیں دل کے زخم بھر آنے لگے

بیقراری و پریشانی ہوئی دل کی سوا
جب دمِ زینت وہ اپنی زلف سلجھانے لگے

میں شبِ فرقت اگر ہو جاؤں سرگرمِ فغاں
میرے نالوں سے یقیناً چرخ تھرانے لگے

ہو اگر مقتل میں وہ بیدادگر تیغ آزما
حشر پر ہو حشر برپا موت گھبرانے لگے

دل پرستی سے ملا ہے درسِ فنِ شاعری
اب تو شاعر ہم بھی اے اوتار کہلانے لگے

ستم کے بعد وہ جب ہم پہ لطف کرتا ہے

بگڑے بگڑے کے ہر اک کام پھر سنورتا ہے

غریقِ بحرِ ندامت کو کیوں ہو اندیشہ
کہ ڈوب ڈوب کے عاصی ترا ابھرتا ہے

مقامِ شکر ہے قیدِ حیات سے چھٹنا
نجات پاتا ہے غم سے وہی جو مرتا ہے

شبِ الم کا نہ احوال پوچھ اے غمخوار
بتاؤں کیا جو قلق جان پہ گذرتا ہے

یہ سوچتا ہوں کہ اظہارِ سوزِ عشق کروں
شرارِ آہ سے لیکن وہ شوخ ڈرتا ہے

ہم اس کے شیوۂ جور و جفا پہ شیدا ہیں
ہمارے جوشِ وفا پر وہ ناز کرتا ہے

وفورِ شوق نے مجبور کر دیا اس کو
ہر ایک کام اب اوتار کر گذرتا ہے

راز افشا ہو گیا کیسی یہ نادانی ہوئی
تیرے نالوں سے ہمیں اے دل پشیمانی ہوئی

جب گریباں ہی نہیں ہے چاک پھر وہ کیا کرے
تیرے وحشی کو سکونِ قلب عریانی ہوئی

چشمِ عاصی سے جو اک اشکِ ندامت بہ گیا
آگ دوزخ کی بھی مارے شرم کے پانی ہوئی

جوششِ وحشت میں خدا جانے کہاں گم ہو گیا
خاکِ کوئے عشق تھی اے دل تری چھانی ہوئی

زلفِ جاناں سے مرے دل کو ازل سے ربط ہے
اُس کی جب الجھن بڑھی اس کو پریشانی ہوئی

وقتِ آرائش جو مشّاطہ نے آئینہ دیا
عکسِ رخ کو دیکھ کر ان کو بھی حیرانی ہوئی

اک مصیبت تھا ترے بیمارِ غم کا ہر نفس
جب اجل آئی سرِ بالیں تو آسانی ہوئی

اپنی محفل سے نکالا اُس بتِ عیّار نے
حضرتِ اوؔنار کی بھی خوب جھانی ہوئی

مستزاد

اگر جوشِ جنوں کر ڈالے مری زنجیر کے ٹکڑے
اڑا دوں دھجیاں صحرا کی چرخِ پیر کے ٹکڑے

ستارے یہ نہیں ہیں یہ ذرا اشکِ ندامت ہیں
چمکتے آسماں پر ہیں مری تقصیر کے ٹکڑے

جوابِ نامہ قاصد سے جو مانگا رکھ دیئے اُس نے

مرے ہاتھوں ہُئیں پرزے خط کے اور تحریر کے ٹکڑے

غلط فہمی ہے اُن کی جو ستارے ان کو کہتے ہیں
فلک پر جل رہے ہیں آہِ آتشگیر کے ٹکڑے

وہ آئینہ ہے یہ جس میں شبیہ یار رہتی ہے
شکستِ دل سے اب ہوتے ہیں اس تصویر کے ٹکڑے

دلِ کم حوصلہ ضبطِ فغاں میں تھا اثر لیکن
تری بیتابیوں نے کر دیئے تاثیر کے ٹکڑے

مرے دل میں ہے لے اوتارِ شوقِ دشت پیمائی
مدد اے جوشِ وحشت کاش ہوں زنجیر کے ٹکڑے

غزل

کھڑا ہوں در پہ میں سر جھکائے — کوئی بہرِ خدا خنجر اٹھائے
جو دامن تر کریں اشکوں سے عاصی — تو یہ سمجھو کہ وہ گنگا نہائے
مبارک ہو گیا بیمار ہونا — عیادت کو ہمارے گھر وہ آئے
نہیں ملتا کہیں درد آشنا دل — کوئی کیا داستانِ غم سنائے
شبِ غم جس کے حصہ میں ہو ناصح — وہ آخر کیا کرے گر مر نہ جائے
اثر کچھ جذبۂ دل میں جو ہوتا — چلے آتے وہ خود ہی بے بلائے
بتوں ہی کی نہیں ہم کو شکایت — ہزاروں آسماں نے ظلم ڈھائے
ریاضِ دہر میں اتنا رہ ہم نے — بہت صدمے سہے اور غم اٹھائے

شمع ساں تا زیست مصروفِ فغانِ زندگی
عاشقِ ناکام کی ہے داستانِ زندگی

جانِ دل ایمانِ دل آرام و جانِ زندگی
تو جو آجائے تو ہو کچھ اور شانِ زندگی

ہمتِ پروانہ کیا دم بھر میں ہو جانا فنا
شمع ساں کرتا ہوں میں شب بھر بیانِ زندگی

ایک مونس بھی نہ تھا بیمارِ غم کا ہجر میں
بیکسی تھی وقتِ آخر نوحہ خوانِ زندگی

ہوں سراپا سوز مثلِ شمع اے اوتارؔ میں
رات بھر جل کر کہوں گا داستانِ زندگی

اک زمانہ ترا سائل نظر آتا ہے مجھے
ذرہ ذرہ ہمہ تن دل نظر آتا ہے مجھے

رخِ زیبا پہ ترے تل نظر آتا ہے مجھے
پیکرِ حسن میں وہ دل نظر آتا ہے مجھے

آنکھ پڑتی ہے اسی غیرتِ خورشید پہ جب
چرخ پر گومہ کامل نظر آتا ہے مجھے

اب خدا کے لئے اے بادِ مخالف رک جا

کچھ نشانِ لبِ ساحل نظر آتا ہے مجھے

ناتوانی سے ہوں مجبور نہیں اٹھ سکتا
ہر قدم صورتِ منزل نظر آتا ہے مجھے

شدتِ یاس سے افکار پہ اب حال ہوا
کام آسان بھی مشکل نظر آتا ہے مجھے

ایسا بھی کوئی دن تھا کہ میں نے وفا نہ کی
میری وفا کے بعد بتوں نے جفا نہ کی
(۲۲-۱-۴۵)

ناکام نامراد بقیدِ حیات ہوں
یعنی مری قضا نے ابھی تک وفا نہ کی

مانوں میں کس طرح کہ مسیحائے وقت ہو
تم نے مریضِ عشق کی کوئی دوا نہ کی

دیکھا جب اس صنم کو تو یاد آگیا خدا
نادان ہیں جو کہتے ہیں یادِ خدا نہ کی

پوچھا نہ حالِ زار دلِ بے قرار کا
عاشق کی قدر تو نے بتِ بے وفا نہ کی

معلوم تھا کہ اس میں اثر خاک بھی نہیں
اے ہمنشیں اسی لئے ہم نے دعا نہ کی

آنکھوں کا تھا قصور جو دیکھا تھا حُسن کو
دل کہہ رہا ہے میں نے تو کوئی خطا نہ کی

اوتار روبروئے صنم کیا ہوا تجھے
خاموش ہو کے بیٹھ رہا التجا نہ کی

زمانے سے نہ ہرگز رنج و غم کی داستاں کہیے
جو ہو درد آشنا اے دل اسی کو رازِ دل کہیے ۱۹۴۹ء

حیاتِ چند روزہ کو بلائے آسماں کہیے
پیامِ مرگ کو لیکن نشاطِ جاوداں کہیے

نظر آتی نہیں اے دل کوئی صورت رہائی کی
مناسب ہے یہی اب تو قفس کو آشیاں کہیے

ہوئے جب خوگرِ جور و جفا تو پھر یہ لازم ہے
اگر نامہرباں ہو وہ صنم تو مہرباں کہیے

اسیری میں یہی اک غم غلط کرنے کی صورت ہے
قفس کو آشیاں صیاد کو اب مہرباں کہیے

اثر کچھ بھی نہیں اشعار کا تیرے حسینوں پر
تجھے اوتار پھر کیوں شاعرِ جادو بیاں کہیے

جب شباب آیا نگاہوں میں حیا بھی آئی ۱۹۴۹ء

ان کی سفاک اداؤں میں جفا بھی آئی

آہ میں بھی تھا اثر میری دعا میں بھی تھا
وہ بھی بالیں پہ چلے آئے قضا بھی آئی

وائے قسمت کہ شب وصل بھی ناکام ہوئی
وہ اگر آئے تو ساتھ ان کے حیا بھی آئی

تو نہ آیا بہت بیداد عیادت کے لئے
تیرے بیمار کی پرسش کو قضا بھی آئی

سچ ہے اوتار گلہ ہے برا الفت کے بغیر
شکوہ لب پر اگر آیا تو دعا بھی آئی

دل کسی کے عارض پر نور کا پروانہ ہے — ہم جسے ہشیار سمجھے تھے وہ اب دیوانہ ہے
لطف ہے وہ بے خبر ہیں ناز معشوقانہ ہے — جو سلوک ان کا ہے عاشق سے وہ سفاکانہ ہے
دل میں اک مدت سے جوش الفت جانانہ ہے — جائے حیرت ہے خدا کے گھر میں بھی بتخانہ ہے
ہجر کی شب کوئی بھی ہمدم نظر آتا نہیں — دل بھی عشق یار میں اپنا نہیں بیگانہ ہے
خود فراموشی ہے حاصل غم فراموشی ہوئی — دہر کے میخانہ میں جو مست ہے فرزانہ ہے
چرخ ہفتم سے بھی بالاتر نشیمن ہے مرا — ہمت عنقا ہی عاجز اس جگہ کاشانہ ہے
کیسی توبہ کیسی توبہ مژدہ باد اے میکشو — آج رخ ابر سیہ کا جانب میخانہ ہے
داخل جنت ہوئے ہیں مست صہبا ہو کے — کس قدر ان زاہدوں کی جرأت رندانہ ہے

شوخیاں ہی شوخیاں ہیں اُس سراپا حسن میں
ہر ادا مستانہ ہے ہر ناز بیباکانہ ہے

رند اے اوتار سمجھوں یا تجھے شیخِ حرم
لب پہ توبہ توبہ لیکن ہاتھ میں پیمانہ ہے

قفس میں مجھکو خیالِ چمن غنیمت ہے
وطن سے دور ہوں یادِ وطن غنیمت ہے

ستم سے ہاتھ اٹھایا اب اس جفا جو نے
ہمارے سینے میں داغِ کہن غنیمت ہے

وفائے عہد کی امید کس کو ہے لیکن
ترا تو وعدہ ہی پیماں شکن غنیمت ہے

برا کہا ہمیں گو اس نے ہم یہی سمجھے
کہ مونہہ سے بولا وہ غنچہ دہن غنیمت ہے

دلِ ستم زدہ مانا کہ مے نہیں ملتی
نگاہِ ساقیِ توبہ شکن غنیمت ہے

رفیق کوئی تو اپنا ہو دشتِ غربت میں
نہیں جو راہ نما راہزن غنیمت ہے

دکھائیں جلوۂ رعنا وہ خواب ہی میں کبھی
یہی نگاہِ دلِ پر محن غنیمت ہے

جگر کے داغ بھڑکتے ہیں آتشِ گل سے
یہ تم نے کیا کہا سیرِ چمن غنیمت ہے

نگاہِ لطف مرے حال پر نہیں نہ سہی
جفائے یار دلِ پُر محن غنیمت ہے

زمانہ فن سے ہے بیگانہ اب تو اے افگار
رہی سہی تری شانِ سخن غنیمت ہی

مداوا درد کا اپنے وہ مرگِ ناگہاں سمجھے
تجھے اے دشمنِ جاں جو مسیحائے زماں سمجھے

عدو کو دوست ہم کو تم عدوئے جانِ جاں سمجھے
سمجھ کا پھیر ہے یہ جو سمجھنا تھا کہاں سمجھے

اسیرِ نو نہیں ہیں ہم جو گھبرا کر کریں نالے
سنبھالا ہوش جب سے ہم قفس کو آشیاں سمجھے

یہ حیرت ہے رہے خاموش بزمِ ناز میں دونوں
ہم ان کو بے دہن سمجھے وہ ہم کو بے زباں سمجھے

اٹھائیں سختیاں کیا کیا سہے جور و ستم لاکھوں
کسی کے عشق کو ہم تو بلائے آسماں سمجھے

اسیری میں دلِ بیتاب کو اس طرح بہلایا

قفس کو آشیاں صیاد کو ہم باغباں سمجھے

گیا تھا نامہ بر بن کر وہیں کا ہو رہا ظالم
وہی نکلا رقیب اپنا جسے ہم رازداں سمجھے

محبت سے نہیں جب آشنا دل تیرا اے ناصح
تو کیا سوزِ نہاں جانے تو کیا عشقِ بتاں سمجھے

سمجھ میں بات ہی کوئی نہ بزمِ ناز کی آئی
فقط جلنا ہی ہم اس انجمن میں شمع ساں سمجھے

سمجھتے تھے جسے ہم رہنما وہ راہزن نکلا
وہی صیاد نکلا ہے جس کو باغباں سمجھے

تمہاری ہے سمجھ الٹی تم اے اوتار ناداں ہو
ذرا سوچو تو کس نا آشنا کو مہرباں سمجھے

آسمانِ حسن پر اک آفتاب آنے کو ہے
عشق کی دنیا میں گویا انقلاب آنے کو ہے

کس لئے اے واعظو میں بادہ نوشی چھوڑ دوں
روز یہ کہتے ہو تم روزِ حساب آنے کو ہے

پھر تر و تازہ ہیں امیدیں دلِ ناکام کی
پھر گیا ہے لیکے خط قاصد جواب آنیکو ہی

تم کو اے اوتارؔ فرقت میں نہ نیند آئی کبھی
ہم نے جب دیکھا یہی دیکھا کہ خواب آنکھوں ہے

دل لے لیا ہے میرا اک شوخ خوبرو نے
رسوا کیا جہاں میں ارمانِ آرزو نے

مردوں کو زندہ کرنا اعجازِ عیسوی تھا
زندوں کو مار ڈالا رشکِ مسیح تو نے

تھا ذہن کی حدوں سے بالا مقام میرا
عنقا کے پر جلائے میری ہی جستجو نے

گلچیں سے کہہ رہا ہے کھل کر ہر ایک غنچہ
مجھ سے چمن چھڑایا میرے ہی رنگ و بو نے

دیکھو یہ بے حجابی شایانِ حسن کب ہے
رسوا کیا ہے تم کو بے باکئی عدو نے

اوتارؔ اس صنم سے کیونکر نبھے گی تیری
رخسار جو صبا کو دیتا نہیں ہے چھونے

ہو چکی بخت آزمائی ہو چکی
ان بتوں سے آشنائی ہو چکی

رہزنوں سے رہنمائی ہو چکی
میکدے میں پارسائی ہو چکی

کعبۂ دل کی زیارت کیجئے
بتکدے میں جبہ سائی ہو چکی

ہو چکا قہر و ستم جور و عتاب    اب تو مل بیٹھو لڑائی ہو چکی
یہ خیالِ خام ہے اے دل ترا    اس ستمگر سے بھلائی ہو چکی
مر کے شاید قیدِ غم سے چھوٹ جائیں    زندگی بھر تو رہائی ہو چکی
وصل کی شب بھی اگر روٹھے رہے    جانِ من مقصد برائی ہو چکی
ضعف سے ہے رخصتِ تابِ فغاں    انتہائے نارسائی ہو چکی
اب تو چشمِ لطف سے دیکھو تو    بیوفاؤ بے وفائی ہو چکی

عزمِ کعبہ کیجئے اوتار اب
بتکدہ تک تو رسائی ہو چکی

(غزل ۲۲)

رخصت ہے تابِ نالہ بیمارِ ناتواں سے
کیا کر دیا یہ تم نے کچھ تو کہو زباں سے

کیا فائدہ جو لب ہو نا آشنا فغاں سے
ہوتا ہے راز افشاں جب چشمِ خونفشاں سے

یوں تو بہت نشیمن ہیں گلشنِ جہاں میں
ہے برق کو عداوت میرے ہی آشیاں سے

ہر ہر نفس جب ان کا آمادۂ سفر ہے
کیا خوف عاشقوں کو پھر مرگِ ناگہاں سے

حالِ زبوں ہے میرا اک درس اس جہاں میں

عبرت کریں گے حاصل سب میری داستاں سے

ظلمت کو دخل کیا ہے اب میرے غمکدہ میں
ہر داغِ دل ہے روشن سوزِ تپِ نہاں سے

او تمار کیوں نہ میرے اشعار میں اثر ہو
الفت ہوئی ہے مجھ کو اک شوخ خوش بیاں سے

غزل

یہ حالت ہو گئی ہے ہجر میں اب چشمِ گریاں کی
مرے ہر اشک نے تاثیر پیدا کی ہے طوفاں کی

الٰہی کس طرح نکلیں تمنائیں دل و جاں کی
لگاتا ہے وہ تلووں میں حنا بھی خونِ ارماں کی

نگاہِ شوق کو ہے آرزو اس آفتِ جاں کی
ادا دلکش نظر سفاک جس کی چال ہے بانکی

اڑائیں دھجیاں گھبرا کے دامان و گریباں کی
میں ممنونِ جنوں ہوں مشکل اس نے میری آساں کی

گلہ کیوں درد کا ہوتا نہ ہوتا دل جو پہلو میں
نہ ہوتا درد اگر دل میں تو حاجت کیا تھی درماں کی

نہیں ہے ہم نفس یاں راز داں کوئی تو اچھا ہے
نہ ہو گی کوئی عریانی ہمارے رازِ نہاں کی

بتوں کے عشق میں اکثر خدا کو یاد کرتے ہیں
ہمارے کفر میں بھی ہے جھلک اے شیخ ایماں کی

سلام اوتار کا اے ساکنانِ کوہِ منصوری
نہ بھولے یاد اس آتش بجاں آتش بداماں کی

قفس میں ہوں مگر یہ التجا ہے ہم صفیروں سے
مجھے بھی یاد کرنا جب ہنسیں کلیاں گلستاں کی

یہ چھوڑ دے اے آسماں ہم کو ستانا چھوڑ دے
رو رہے ہوں خوں دہی جوان کو رلانا چھوڑ دے ۱۹۳۲ء

کر کے وعدے اے ستمگر بھول جانا چھوڑ دے
کاش یوں بھی ہو کہ تو ہم کو ستانا چھوڑ دے

کیوں جلاتا ہے ہمارا خرمنِ صبر و شکیب
برق کی مانند ظالم مسکرانا چھوڑ دے

ہے گہن یہ چاند کا صدقے میں دے بوسے ہمیں
یار رخِ روشن کو زلفوں سے چھپانا چھوڑ دے

حاصلِ الفت یہی ہے۔ ہے یہی تکمیلِ عشق
اے دلِ صبر آزما بخت آزمانا چھوڑ دے

اے فلک سیکھا ہے ناتجھ کو طرزِ رقصِ برق پر

وہ اگر دیکھے مرا دل تلملانا چھوڑ دے

درد کی تجھ کو شکایت جور کا تجھ کو گلا
اس سے تو بہتر ہے تو دل ہی لگانا چھوڑ دے

عشق کہتا ہے کہ آ بزمِ بتاں میں لے چلوں
عقل کہتی ہے کہ اس محفل میں جانا چھوڑ دے

بے وفاؤں سے عبث ہی تجھ کو امیدِ وفا
چھوڑ دے اَو تمار ان سے دل لگانا چھوڑ دے

یا تو بتوں کو حُسن نہ پروردگار دے
یا عاشقوں کو دل ہی پہ کچھ اختیار دے

عاشق کے دل کو ہمتِ صبر و قرار دے
جب دل کو بیخودی نگہِ شرمسار دے

اس بیقرار دل کو بھی صبر و قرار دے
رُخ سے نقاب او بُتِ کافر اتار دے

وصلِ صنم کی رات ہے شکوؤں سے درگذر
اے دل وفا کو حوصلۂ اختصار دے

جوبن شباب پہ ہے خدارا تو اے صنم
بہرِ نگاہِ بد کوئی صدقہ اتار دے

وعدہ وہ آ کے خواب میں شاید وفا کریں
سوئے اگر مجھے یہ دلِ بیقرار دے

پینے کا پھر تو لطف ہوا آتا بادہ نوش
ساغر جب اپنے ہاتھ سے وہ گلعذار دے

حرم میں بھی وہی ہو دیر میں بھی اس کا جلوہ ہو ۱۹۱۳ء
وہی مسجودِ زاہد ہے برہمن جس کا بندہ ہے

نہیں جو درد کا حامل اسے ہم دل نہیں کہتے
غلط ہے عشق کا دعویٰ اگر لب صرفِ شکوہ ہو

گذر اس کا نہیں اے غافلو چشمِ مجازی میں
حقیقت بیں نگاہوں سے مگر کب اُس کو پردہ ہو

نہیں منت کشِ تدبیر قسمت کی کجی اے دل
رہین ناخنِ عقدہ کشا کب میرا عقدہ ہے

کمالِ عشق ہے زندہ دلی کو زندگی کہنا
نہیں زندوں میں تو شامل اگر دل تیرا مردہ ہے

حقیقت آشنا ہو کر ہوا آوارہ اس قابل
جدھر بھی دیکھتا ہوں یار کا جلوہ ہی جلوہ ہے

کبھی تو اشکِ ندامت سے چشم نم کر دے ۱۹۱۳ء

یقیں ہے تیرے گناہوں پہ وہ کرم کر دے

میرے گناہ بہت تو مگر ہے بندہ نواز
معاف تجھ کو ترے رحم کی قسم کر دے

گناہ میرے مبدل ثواب سے ہو جائیں
جو میرے حال پہ اے شیخ وہ کرم کر دے

اسی کے لطف کی خواہاں ہو میری چشم امید
جو کم کو بیش کرے بیش کو جو کم کر دے

اسی کے رحم کا ہوں ملتجی میں اے اوتار
جو اپنے فیض سے ہر دشت کو ارم کر دے

بڑا بیدرد ہے نا آشنا ہے بے مروت ہے
دلِ کم بخت کو لیکن اسی کافر سے الفت ہے

دلِ بے آرزو راہِ وفا میں ایک نعمت ہے
نہ شکوہ ہے جفاؤں کا نہ ارماں ہے نہ حسرت ہے

کسی کا اوج گر اہلِ جہاں کو وجہِ ہمت ہے
مری پستی بھی تو اہلِ نظر کو ایک عبرت ہے

نگاہیں آشنا کیا ہوں جمالِ حسنِ معنی سے
کہ تیرے دل کے آئینے میں تو زنگِ کدورت ہے

صنم کو دیکھ کر ہم دیکھتے ہیں قدرتِ صانع
ہماری بت پرستی درحقیقت اک عبادت ہے

کرم تھا یا ستم لیکن تعلق ان سے قائم تھا
غضب تو یہ ہے اب انکو عداوت ہے نہ الفت ہے

بقائے دائمی دشوار ہے دنیائے فانی میں
فسانہ خضر کا بھی اک کہانی ہے حکایت ہے

دلِ حسرت زدہ وہ رحمتِ حق جوش پر آئی
کہ تاثیر آشنا میرا ہر اک اشکِ ندامت ہے

مرا دل لے کے جاتے ہیں مجھے وہ چھوڑ کر تنہا
قیامت ہے قیامت ہے قیامت ہے قیامت ہے

شرارِ آہ ہیں یا برقِ آتشگیر کے ٹکڑے ۱۹۱۳ء
اُڑا دیں گے شبِ فرقت یہ چرخِ پیر کے ٹکڑے

بنا لے سے بگڑ جاتا ہے میرا کام اے ہمدم
مری تقدیر کرتی ہے مری تدبیر کے ٹکڑے

بکالا تیر گر تو نے خلش پھر بھی رہی باقی
ابھی تک چبھ رہے ہیں دل میں تیرے تیر کے ٹکڑے

اگر سودا سلامت ہے تری زلفِ مسلسل کا

اڑا دیگا یہ وحشی آہنی زنجیر کے ٹکڑے

دمِ اقرار کچھ کہہ کر ہوا خاموش وہ ظالم
ستم ہے ہو رہے ہیں بے طرح تقریر کے ٹکڑے

ہیں عاصی ہوں مگر اے زاہد و غرقِ ندامت ہوں
کیے خود جوشِ رحمت نے مری تقصیر کے ٹکڑے

سحر تحفل جو کی افتادہ نے توصیف رعنائی
کیے اس شاہد مغرور نے تصویر کے ٹکڑے

ہم پہ جب احسان کیا جلاد کی شمشیر نے
کر دیئے سب بند جور و ظلم چرخ پیر نے

بات بننے ہی نہ پائی کوئی شوقِ وصل میں
کر دیئے ٹکڑے مری تدبیر کے تقدیر نے

روبروئے عاشقِ دیوانہ ہے زلفِ دراز
اور سودائی کو جکڑا حلقۂ زنجیر نے

کب ہوا ناکامی قسمت سے ہیں مسرورِ وصل
کوششیں لاکھوں اگرچہ کیں مری تدبیر نے

ہو گیا امیدوار رحمت پروردگار
مجھ کو پہنچایا ہے جنت تک مری تقصیر نے

میری بیچینی سے ہو جائیں گے وہ بھی بیقرار
جوشؔ گر کچھ بھی دکھایا آہِ پُر تاثیر نے

رات بھر وہ بھی رہے بیچین بزمِ ناز میں
حق ادا اپنا کیا ہے نالۂ شبگیر نے

سامنے جب کوئی آیا ہم رہے محوِ سکوت
ہائے کیا دھوکا دیا ہے قوّتِ تقریر نے

الوداع اے کوہِ منصوری کہ اب جاتے ہیں ہم
آتشِ سی پی میں جھونکا ہے ہمیں تقدیر نے

سوزِ غم کہتے غزل ہیں کیوں نہ اے افتخار ہم
نیند آنے دی نہ دم بھر بادِ آتشگیر نے

شفق بن کر عیاں جو شام کو بالائے گردوں ہے
یہ کس بیکس کی حسرت ہے یہ کس ناکام کا خوں ہے

سوادِ شام کو سایہ سمجھئے زلفِ مشکیں کا
کسی کے عارضِ انور کا پرتو مہر گردوں ہے

نہ ہوتا عشق اگر تو حسن کی پھر قدر کیا ہوتی
ہوئی مشہور لیلی یہ فقط احسانِ مجنوں ہے

جسے رنگِ حنا سمجھا وہ گلرو وقت آرائش

کسی ناکام عاشق کے دلِ پامال کا خوں ہے

نصیبا ہے جدا ہر ایک کا قسمت جدا سب کی
گدا کوئی کسی کے فرق پر تاجِ ہمایوں ہے

دیا اوتار تو نے آپ ہی دل اس پری رُو کو
یہ جوشِ گریہ کیا معنی یہ آہ و فغاں کیوں ہے

غزل

شب منفعل ہے زلفِ معنبر کے سامنے
شرمندہ ماہ روئے منور کے سامنے

کچھ انتہا نہیں ہے مرے اضطراب کی
لرزاں ہے برق تک دلِ مضطر کے سامنے

اللہ رے آرزوئے شہادت کہ میرا سر
جھکتا ہے خود بخود ترے خنجر کے سامنے

کیا ہنس رہی ہے دیکھ تو جل جائیگی ابھی
اے برق اک تبسمِ دل بر کے سامنے

تدبیر لاکھ کی نہ ہوا کچھ بھی فائدہ
مجروح دل کو چشمِ ستمگر کے سامنے

قسمت میں جو لکھا ہے وہ مٹتا نہیں کبھی
تدبیر کیا کرے گی مقدر کے سامنے

دل کے مکاں میں دیکھو یہ تم ڈھونڈھتے ہو کیا
مسجد کے سامنے کبھی مندر کے سامنے

اوتار لکھ کے بھیجنے میں کچھ مزا نہیں
لطفِ سخن ملے گا سخنور کے سامنے

غزل

وہ عالمِ فغاں ہے نہ جوش و خروش ہے
مدت سے آہ بند ہے نالہ خموش ہے

غفلت سرائے دہر میں ہے کون باخبر
ہے کون جو کہ صاحبِ تمکین و ہوش ہے

ذوقِ سخن نہ لطف ہے دید و شنید میں
اب دل کو شکوۂ دہن و چشم و گوش ہے

تھا خاکسار عاشقِ بیکس حیات میں
دیکھا فنا کے بعد تو بالائے دوش ہے

اپنی نقاب الٹ کے کوئی بزمِ ناز میں
کہتا ہے آئے سامنے جو دل فروش ہے

اہلِ سخن کی بزم میں گویا مرا سخن
دل کی ہے اک امنگ طبیعت کا جوش ہے

اوتار کے کلام کو سن کر وہ کہتے ہیں
انسانِ خوش مزاج مگر بادہ نوش ہے

برقع سے چھن کے سوئے چمن جب گذر گئی ۱۹۴۹ء
ان کی نگاہِ ناز بھی کیا گل کتر گئی

زلفِ سیاہ جب ترے رُخ پر بکھر گئی
یہ آسمانِ حُسن کا دامن کتر گئی

وحشت کو میری دیکھتے ہی نیند ڈر گئی
مدّت سے منتظر ہوں کہاں تا سحر گئی

صبحِ شبِ وصال چلا جب وہ خوش جمال
جانِ حزیں پہ میرے قیامت گذر گئی

اختر فلک پہ آئے نظر صورتِ شرر
جب آسماں پہ آہِ دلِ نوحہ گر گئی

پہلے تو دل مرا ترے کوچے میں گم ہوا
پھر جانِ زار لینے کو اس کی خبر گئی

نالہ دفورِ ضعف سے نکلا نا رسا مگر
کم بخت آہ بھی تو مری بے اثر گئی

پوچھا انھوں نے حالِ دلِ زار بھی تو کب
جب موت آکے میری زباں بند کر گئی

چھوٹی نہ ہم سے رسمِ وفا کوئے عشق میں

خوئے جفا نہ تیری بت فتنہ گر گئی
مانند شمع میں سرِ محفل جلا کیا
تھوڑی سی عمر روتے ہی روتے گذر گئی

پوچھا نہ میں نے رشک سے گھر کا ترے پتہ
دل کو بکو پھرا مری جاں دربدر گئی

مشتاقِ دید جب کبھی سنبھلا شبِ فراق
آنکھ اس کی سوئے روزنِ دیوار و در گئی

سودائے زلف جس کو ہو کیوں ہو نہ تیرہ بخت
جیتا نہ چھوڑے گی یہ بلا جس کے سر گئی

مہمان جانِ زار تھی خاکی مکان میں
آئی تھی جس جگہ سے یہ واپس ادھر گئی

ہے یہ وجود ہستیٔ ناپائیدار کا
اس کا قیام برق تھا مثلِ شرر گئی

شاہوں سے بھی بلند ہوا اپنا مرتبہ
دل سے ہمارے جب ہوسِ مال و زر گئی

دیتا ہے کون دادِ کمالِ سخن کی اب
اوتار اب تو وقعتِ اہلِ ہنر گئی

ہے وعدۂ دیدار تو ہو کاش وفا بھی
مر جاؤں گا کی تم نے جو تاخیر ذرا بھی

دل لے کے یہ اے بانیِ بیداد بتا بھی
اس درد کی جز وصل ہے کچھ اور دوا بھی

اس بت کے تغافل کا گلہ ہی نہیں لب پر
"فرقت میں تو سنتا نہیں عاشق کی خدا بھی"

وہ نالہ جو جاتا تھا کبھی عرشِ بریں تک
لب تک مرے آتا ہے جو ہوتا ہے رسا بھی

ملتے بھی اگر ہیں تو یہ بت بزمِ عدو میں
کیا بات کرے کوئی کہ آتی ہے حیا بھی

میں بلبلِ دیوانہ ہوں مرتا ہوں جو تجھ پر
وہ پھول ہے تو جس میں نہیں بوئے وفا بھی

امیدِ وفا کیسی ہمیں ڈر ہے اسی کا
کر دے نہ کہیں ترک وہ اندازِ جفا بھی

فریاد اگر جرم ہے آئینِ جفا میں
ہو جاتی ہے عاشق سے مری جان خطا بھی

یہ شیوۂ بیداد ستمگر نہیں اچھا

سن لے کبھی تو اُف کی جگہ کاش دعا بھی

اس بت سے نکل آئے کوئی وصل کی صورت
ہوں ناخنِ تدبیر اگر عقدہ کشا بھی

نوحہ میں بدل دیتا ہے یہ چرخِ ستمگر
قسمت سے جو ہوتا ہوں کبھی نغمہ سرا بھی

پھر فصلِ بہار آئی ترو تازہ ہیں غنچے
اتراتی ہوئی پھرتی ہے اب بادِ صبا بھی

ہم کوچۂ الفت میں وہ مشتاقِ فنا ہیں
ٹھوکر سے لنڈھا دیں جو ملے آبِ بقا بھی

یہ وادیٔ غربت میں ہے انجام ہمارا
منزل سے بہت دور ہیں اور آبلہ پا بھی

تو نیک ہے اوتار تو بد ہو نہیں سکتا
کہنے دے جو کہتا ہے کوئی تجھ کو برا بھی

سجدے میں اس کے در پہ جبینِ نیاز ہے
جس کے کرم کو عفوِ معاصی پہ ناز ہے

عصیاں کا خوف کیا ہے وہ ذرّہ نواز ہے
عاصی کے واسطے تو درِ توبہ باز ہے

اے ناخدا بچائیو گرداب جرم سے
بحرِ خطا میں عمرِ رواں کا جہاز ہے

وہ میرے دل میں قیس کو لیلیٰ کی آرزو
میں آشنائے حق ہوں وہ محوِ مجاز ہے

کر ضبطِ اشک بزم میں رسوا نہ کر مجھے
اے چشم دیکھ خطرۂ افشائے راز ہے

اے چرخ تو نے خاک میں سب کو ملا دیا
اب عشقِ غزنوی نہ وہ شکلِ ایاز ہے

اوتار سوزِ عشق سے اپنا دلِ حزیں
روشن مثالِ شمع سرِ بزمِ ناز ہے

غزل

دلِ نافہم یہ ہوا کیا ہے — عشق میں رنج کے سوا کیا ہے
دلِ ناکام کے مٹانے سے — اے فلک تیرا مدعا کیا ہے
نہ رہی جب کہ تاب گویائی — پوچھتے ہیں وہ مدعا کیا ہے
جب یقیں ہے کہ وہ نہ مانیں گے — کیوں بتائیں کہ التجا کیا ہے
جو ہو ناآشنائے مہر و وفا — وہ یہ کیا جانے آشنا کیا ہے
عشق کی جس کو ابتدا نہ ملی — پوچھتے کیا ہو انتہا کیا ہے
دل ہے محوِ بتاں مگر اوتار — سوچتا ہوں کہ مدعا کیا ہے

۱۹۲۹

ممکن نہیں کہ دعویٰ بجا کرے کوئی
دل تم کو دے کے دل کی تمنا کرے کوئی

دل دے کے پہلے درد کو پیدا کرے کوئی
پھر اس کے بعد تیری تمنا کرے کوئی

بالائے چرخ بیٹھ کے دعویٰ کرے کوئی
ہم اس کو جانیں ہم کو جو اچھا کرے کوئی

گم ہو کے اپنے نام کو رسوا کرے کوئی
کس واسطے حماقتِ عنقا کرے کوئی

جب تنگ نہ چشم صرفِ تماشا کرے کوئی
مشکل ہے قلبِ تنگ کا در وا کرے کوئی

حیرت میں ڈال رکھا ہے برقِ جمال نے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

ظاہر ترے وجود سے اک یہ غرض بھی ہے
اس چہرۂ کج ادا کو بھی سیدھا کرے کوئی

جائے حنا ہو خونِ جگر زینتِ بتاں
پھر میری طرح عشق کا دعویٰ کرے کوئی

اک اک ادا پہ مانگتا ہے دل وہ نازنیں

دل اتنے پھر کہاں سے مہیا کرے کوئی

رکھتا نہیں وہ دل جو ہو منت کشِ دوا
کیوں عشق میں تلاشِ مسیحا کرے کوئی

فرصت نہیں ہو رنج و غمِ جاں گداز سے
عشقِ صنم کی خاک تمنا کرے کوئی

چپ سے مری خفا ہو جو بولیں تو ہے گلہ
طرزِ ستم یہی ہے تو پھر کیا کرے کوئی

جب دل ہو دل تو اپنی وفا کا اثر بھی ہو
وہ دل ہے سنگ سنگ میں کیا جا کرے کوئی

وہ جانتا نہیں ہے وفا کس کا نام ہے
اس بیوفا کا خاک بھروسا کرے کوئی

پُر کیف ہو خیال ہی جب چشمِ مست کا
پھر کیوں تلاشِ بادہ و مینا کرے کوئی

گھر میں بھی سر پہ خاک اڑانے کو کم نہیں
رُخ کس غرض سے جانبِ صحرا کرے کوئی

دل میرا اضطراب سے ہے یوں بھرا ہوا
کوزے میں بند جیسے کہ دریا کرے کوئی

کیا ہے امید ہستی ناپائیدار سے
کیوں رنج بے ثباتی دنیا کرے کوئی

اوتار چاہتا ہوں کہ اقبال کی طرح
گر گر پڑوں میں مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

(۱۹۲۱ء)

دل کے جذبات ہوتے جو بس کے
کیوں ہوں پابند وحشی قفس کے

زلفِ پرخم سے باندھی ہیں مشکیں
طائرِ دل کی کیا خوب کس کے

ان کا رتبہ ہے شاہوں سے اعلیٰ
جو کہ بندے نہیں ہیں ہوس کے

شمع گل ہو گئی شب گذرتے
"پھول کملا گئے رات بس کے"

زلف تیری کہ مارِ سیہ ہے
جان لیتی ہماری ہے ڈس کے

برق جلتی ہے کیوں اس قدر تو
دیکھ کر آشیانے کو خس کے

دل ہے اوتار محوِ اسیری
آپ چن لایا تنکے قفس کے

(۱۹۲۹ء)

فصلِ بہار آ گئی رخصت خزاں کی ہے
ہر سو صدا یہ بلبلِ دلکش بیاں کی ہے

مدت سے قیدِ دام میں تھی عندلیب زار
آزاد آج جان اسی ناتواں کی ہے

اے قلبِ بیقرار سرِ بزم ضبط کر

رسوائی آہ سے مرے رازِ نہاں کی ہے

وہ گم شدہ ہوں میں نہیں اپنی خبر مجھے
عنقا کو بھی تلاش مرے آشیاں کی ہے

اک عمر ہو چکی ہے کہ رسوائے خلق ہوں
اب تک جبیں پہ خاک اُسی آستاں کی ہے

کج پشت سے نہ چھوٹی نہ چھوٹیگی کجروی
روزِ ازل سے ٹیڑھی روش آسماں کی ہے

دنیائے بے ثبات میں برق و شرر کو دیکھ
غافل مثال یہ تری عمرِ رواں کی ہے

آزارِ عشق ہو گیا کس سے گلا کروں
یہ تو لگائی آگ کسی مہرباں کی ہے

افگار کیوں نہ ناز کروں حسنِ نظم پر
محفل فریفتہ مرے طرزِ بیاں کی ہے

ہمارے ہاتھ میں جامِ شراب رہنے دے
سپہر اوج پہ ہے آفتاب رہنے دے ۱۹۲۹ء

بیانِ پرسشِ روزِ حساب رہنے دے
نہ چھیڑ بحثِ ثواب و عذاب رہنے دے

ہٹا دے گیسوئے شبگوں کو روئے روشن سے
چھپے نہ ماہ۔ حجابِ سحاب رہنے دے

لبوں پہ جانِ حزیں ہے قریبِ مرگ ہوں میں
الٹ دے رُخ سے نقاب اب حجاب رہنے دے

نہیں ہے محوِ تمنا کو دید کی حاجت
وہ اپنے رُخ پہ حجابِ نقاب رہنے دے

نہ چھیڑ مے کشِ بزمِ ازل کو اے واعظ
ہے اپنے حال میں مستِ خراب رہنے دے

نہیں ہے غم کے سوا کچھ بھی حاصلِ الفت
یہ شغل اے دلِ خانہ خراب رہنے دے

دلنشیں دیر و حرم میں بس اسی کا نام ہو
مختلف گو راستے ہیں ایک ہی انجام ہو ۱۹۲۹ء

دہرِ فانی میں امیدِ راحت و آرام ہے
اے دلِ ناداں ترا یہ کیا خیالِ خام ہے

جانِ من اوتار تیرا خادمِ بے دام ہو
بندگی ہے اسکی فطرت عشق اس کا کام ہو

جو رہا ہو عمر بھر نا آشنائے لطفِ یار

وہ بھلا کیا جان سکتا ہے کہ کیا آرام ہے
اس قدر امید کس کو ہے کہ بوسہ ہو عطا
مجھ کو کافی اے ستمگر لذتِ دشنام ہے

عجب کیا ہے کہ جو مانگوں دہی وہ ماہرو دیدے
مگر پاسِ ادب مجھ کو مجالِ گفتگو دیدے

ترے قرباں ریاض بس ہیں جو چاہے تو دیدے
کسی کو داغِ دل دے دے کسی کو رنگ و بو دیدے

رہے باقی خدایا حوصلہ مشکل کشائی کا
گریباں چاک ہو تو ہمتِ فکرِ رفو دیدے

نہ ارماں ہو نہ حسرت ہو نہ شکوہ بیوفائی کا
خدایا آرزو یہ ہے دلِ بے آرزو دے دے

کہاں قسمت کہ صہبائے وطن سے پُر طرب دل ہو
خدایا تشنہ لب غربت میں ہوں میں آبِ جو دیدے

دہن معدوم ہے جس کا تو اقرارِ وفا کیسا
زباں سے گالیاں وہ چاہے ہی اے تندخو دیدے

وہ بزمِ ناز میں افتار کو کیوں آزماتا ہے
دمِ زینت حنا مانگے تو یہ دل کا لہو دیدے

جب وہ ہنگامِ ستم ترچھی نظر کرتا ہے
مشورہ درد سے دل، دل سے جگر کرتا ہے

زلفِ مشکیں کو شبِ وصل پریشاں کر دے
کس طرح چرخ یہ دیکھوں تو سحر کرتا ہے

وسعتِ رحمتِ حق سے نہ کبھی ہو شاکی
قطرۂ آب کو دم بھر میں گہر کرتا ہے

عشق صادق ہے اگر وصل سے مایوس نہ ہو
قلبِ تبدائے حقیقی میں وہ گھر کرتا ہے

تابِ رخ کا ہے یہ عالم کہ خجل ہیں اختر
روئے روشن پہ ترے رشکِ قمر کرتا ہے

بزم میں ہم بھی ہیں بیٹھے ہوئے اغیار بھی ہیں
کس طرف دیکھیے پہلے وہ نظر کرتا ہے

رہے نہ شکوہ کہ اک امتحان باقی ہے — ستم کرو جو اے آسمان باقی ہے
زباں کا لطف تو پایا بصورتِ دشنام — لبوں کا ذائقہ اے خوش بیان باقی ہے
وہ داغ دیکھ کے کہتے ہیں یہ پہلو میں — جلے ہوئے ترے دل کا نشان باقی ہے
گلا نہیں ہے وہ جی بھر کے آزمائیں مجھے — کسی طرح کا اگر امتحان باقی ہے
تمہیں تو ختم نہیں مشقِ جورِ بے پایاں — عدوئے جان مرا آسمان باقی ہے

ہوا ہے خون بہت میری آرزوؤں کا ملا دے خاک میں امتحان باقی ہو

بڑھا دے اور فلک تو شبِ وصالِ صنم
ابھی تو قصۂ غم کا بیان باقی ہے

کرنے دیا نہ تم نے بیاں مدعا مجھے
الجھایا دامِ زلف میں کیوں بے خطا مجھے

مشتاق دید ہوں نہ زیادہ ستا مجھے
پردہ اٹھا کے اب رخِ زیبا دکھا مجھے

یارب برا ہو اس دلِ خانہ خراب کا
لیجا کے اس کی بزم میں رسوا کیا مجھے

اپنی غمِ فراق میں حالت یہ ہو گئی
روتا ہے دیکھ دیکھ کے ہر آشنا مجھے

تو جانتا بھی ہے کہ ہیں کیا رمزِ حسن و عشق
سمجھا رہا ہے دیر سے کیا ناصحا مجھے

دل میں مرے وہ درد ہے جو لا علاج ہے
کیوں چارہ ساز دیتے ہیں پیہم دوا مجھے

دل دے چکا ہوں جان بھی حاضر ہے اے صنم
باقی ہو امتحان تو پھر آزما مجھے

کہتا ہے رشک نام نہ آئے زباں پر
کیوں کر گلی کا اس کی ملے راستا مجھے

تیرہ شب فراق ہے کچھ سوجھتا نہیں
کام آئے کاش یادِ رخِ پر ضیا مجھے

میں کھو گیا ہوں راہِ محبت میں بے طرح
منزل کا ذکر کیا، نہیں اپنا پتا مجھے

واللہ کیا ہے اس بتِ شیریں دہن کی بات
دشنام دے کے کر نہ سکا بد مزا مجھے

دو چار روز اور رہوں اوتار اس جگہ
یاد آ گئی مصوری کی آب ہوا مجھے

۱۹۲۲ء

پیری میں بھی تو بادہ کشی کا خیال ہے
واعظ کسی کے دل کا بدلنا محال ہے

دلکش جمالِ ماہ بھی وقتِ کمال ہے
تیرا اگر وہ حسن ہے جو لازوال ہے

اوتار جان ہا ہے وہ آشفتہ حال ہے
رنج و الم یہ کیوں ہے یہ کیسا ملال ہے

ہر روز زخمِ تازہ سے دل خستہ حال ہے
ہے زندگی کہ جانِ حزیں کا وبال ہے

ناشاد دل کو یادِ عزیزانِ رفتگان
یہ دلشکن ہے تیغ کہ تیرِ ملال ہے

پستی ہی سے عروج کی منزل ہوئی نصیب
اب بتا مجھے عرقِ انفعال ہے

ممکن نہیں نجات بجز مرگ فکر سے
قیدِ حیات کیا ہے یہ قیدِ ملال ہے

جاتے ہو بعد مرگ جنازے کے ساتھ تم ہے میرے لئے عروج مرا انتقال ہے
وہ گم شدہ ہوں میں نہیں اپنی خبر مجھے گویا مرا وجود بھی عنقا کا بال ہے
کر غور و فکر روزن دل کھول اور دیکھ
اوتار چاہتا جو صنم کا وصال ہے

ہنس رہی ہے برق کیا تو دل جلوں کے سامنے
شوخیاں زیبا نہیں ہیں بے کلوں کے سامنے
نارسائی کا گلہ کس سے کریں ہم غم نصیب
لٹ گئے منزل کے آگے قافلوں کے سامنے
رات بھر کی بادہ نوشی مے کدہ میں شیخ نے
صبح کو مسجد میں آ بیٹھا بھلوں کے سامنے
وائے ناکامی کوئی کرتا نہیں ہے مجھ کو قتل
گھومتا ہوں مدتوں سے مقتلوں کے سامنے
تیرے اڑ جائیں دھوئیں اے برق بس اک آہ سے
رہنے دے رقص اپنا تو ہم دل جلوں کے سامنے
حضرت ناصح گنوا آئے کہاں عقل سلیم
پند کی باتیں ہم ایسے پاگلوں کے سامنے
بادہ نوشی سے اگر اوتار توبہ کی تو کیا دیکھ لیں گے تیری توبہ بادلوں کے سامنے

ناکام دید رہ گیا منزل کے سامنے
اوتار تشنہ کام ہے ساحل کے سامنے

خنجر بکف کھڑے تھے وہ بسمل کے سامنے
بسمل کو اضطراب تھا قاتل کے سامنے

لنگر اٹھا کے چل دیا کشتی کا ناخدا
ہو سو رہا کہاں میں بیٹھ کے ساحل کے سامنے

ہم ہیں نثارِ جاں نثار اگر اس کو عذر ہے
رکھ دینگے سر کو کاٹ کے قاتل کے سامنے

چھپتا ہے چاند روئے منور کو دیکھ کر
اختر فلک کے ماند ہیں اک تل کے سامنے

پھر دیکھ لے کوئی خلش زخم کی بہار
رکھ دے اگر نکال کے دل بسمل کے سامنے

پوچھا جو بوسہ کیوں دیا دشمن کو یہ کہا
منہ پھیریں کس طرح کسی سائل کے سامنے

دکھلاؤں شعلہ آہ کا بھڑکا کے برق کو
چمکاؤں داغ دل مہِ کامل کے سامنے

حسرت ہے اس غریب پہ جو تھک کے رہ گیا
منزل کے اشتیاق میں منزل کے سامنے

اے قلبِ مضطرب تجھے لازم ہے صبر کر
رسوا نہ کر مجھے بھری محفل کے سامنے

ایسا نیاز دل کا ہے اوتار بار بار
سر کو جھکاؤ خنجرِ قاتل کے سامنے

عبث تو اے دلِ مضطر چلا پھر آج سمجھانے
کہ تیری بات کب مانی ہو اس نے جواب مانے

مٹایا مجھ کو کس نے اس ستم پرور خود آرا نے
مجھے بسمل کیا کس نے اسی رشکِ مسیحا نے

زمانہ جانتا ہے تجھ کو او بت یہ سمجھتا ہوں

مگر تو بھی کسی کو چاہتا ہے یہ خدا جانے

ادھر میری پریشانی ادھر وہ محوِ آرائش
الجھتا تھا مرا دل جب وہ بیٹھے زلف سلجھانے

پریشانی میں سبقت لے گئے ہیں گردِ صحرا سے
بیاباں میں بسے ہیں جتنے جا کر تیرے دیوانے

سنو میری تم اے اوتار اور انسان بنجاؤ
تمہیں وحشت نہیں زیبا عبث پھرتے ہو دیوانے

تقدیر میری گوشۂ ظلمت میں سوتی ہے
ہر روز سر پہ بیکسیِ عشق روتی ہے

مجھ کو حریصِ لطفِ خلش دیکھ دیکھ کر
وہ چشمِ شوخ نشترِ مژگاں چبھوتی ہے

اوتار یوں گزرتی ہیں راتیں فراق کی
میں جاگتا ہوں اور مری تقدیر سوتی ہے

مےِ پُر جوش کسی روز پلائی ہوتی — پیاس ساقی نے کبھی دل کی بجھائی ہوتی
کچھ تو ارمان نکلتے دلِ پر حسرت کے — اے خدا وصل کی شب اور بڑھائی ہوتی
داغ ناکامیِ پیہم کا جبیں سے مٹتا — در پہ اس بت کے کبھی میری رسائی ہوتی
خواب ہی میں مجھے پھر جلوہ دکھاتے شاید — شبِ فرقت میں کبھی نیند تو آئی ہوتی

حور کو لیکے میں کیا کرتا تمھارے بدلے
عمر گر میں نے نمازوں میں گنوائی ہوتی

دمِ آخر کوئی دم بھر کے لیے آجاتا
ختم اب تو مری قسمت کی برائی ہوتی

نامہ بر خط نہ لیا تھا اگر اس کافر نے
میری روداد زبانی ہی سنائی ہوتی

دلِ مضطر کہیں جل اٹھتا تو یہ بہتر تھا
آگ اے سوزِ نہاں تو نے لگائی ہوتی

گر بشرِ جام بھی ہو رند بھی ہیں ساقی بھی
سرِ میخانہ گھٹا آج تو چھائی ہوتی

زندگی اپنی بآرام گذرتی اوتار
گر طبیعت نہ کسی شوخ پر آئی ہوتی

دشمنِ جاں دل کا چارہ ساز ہے
ہو نہ ہو اس میں بھی کوئی راز ہے

شوقِ دل کا بھی عجب انداز ہے
خاک ہونے پر بھی اس کو ناز ہے

عشق میں انجام پر بھی اک نظر
اے دلِ مضطر ابھی آغاز ہے

دل میں پیدا اب تو ہو ذوقِ خلش
تیر ہے ترکش ہے تیرانداز ہے

ہم کجا اوتار اور وہ بت کجا
مرغِ دل ناقابلِ پرواز ہے

دل دیا ہے جا رہی ہے جان بھی
جانے دو جائے اگر ایمان بھی

کیجیے ان سے بیانِ دردِ دل
یہ پری رو ہوں مگر انسان بھی

بوسہ کے بدلے ہیں پائیں گالیاں
اور پھر سر پر مرے احسان بھی

دل لگا بیٹھے ہم اک عیار سے
کچھ نہ سوچا فائدہ نقصان بھی

کس طرح اُن کے اٹھائیں ناز اب مٹ گیا جب دِل تو چلدی جان بھی

اک نظر ہی سے نہ سب کو دیکھیے

دوست دشمن میں ہو کچھ پہچان بھی

رنج و غم کا ہر گھڑی آزار ہے زندگی سے جی مرا بیزار ہے

میرے گھر وہ دیکھیے کب آئینگے ایک مدت سے یہی اقرار ہے

نا مجھا بے التفاتی اے مسیح جاں بلب میرا دلِ بیمار ہے

جس نے دنیا آپ پر قربان کی

آپ کا عاشق وہی اوتار ہے

نامرادی بھی جو ہمراہِ نظر جاتی ہے دلِ عاشق پہ قیامت ہی گذر جاتی ہے

نیند وحشت کو مری دیکھ کے ڈر جاتی ہے دیکھ کر حال مرا موت بھی مر جاتی ہے

بادۂ الفتِ دلدار سے مخمور ہیں ہم کب یہ وہ مے ہے جو نشہ بھی اتر جاتی ہے

بزم میں ہم بھی ہیں بیٹھے ہوئے اغیار بھی ہیں دیکھیے اُس کی نظر دیکھیے کدھر جاتی ہے

دل پھڑک اٹھتا ہے اوتار ہمارا اب بھی

جب کسی شوخ پری رو پہ نظر جاتی ہے

پہلو نشیں ہوئے ہوا بھی اک گھڑی ہوئی

ٹھہرو بھی ایسی جانے کی ہے کیا پڑی ہوئی

کہنا ہے کون خال ہے رخسار پہ نرے

میری نظر کی مہر ہے اس پر جڑی ہوئی

بیٹھے ہیں ان کی بزم میں ہم دور اگر تو کیا
ہے آنکھ اپنی ان سے برابر لڑی ہوئی

اوتار دیکھ بادۂ الفت سمجھ کے پی
یہ وہ شراب ہے جو نہ اترے چڑھی ہوئی

دلِ مایوس کی پھر کس طرح امید بر آئے ۱۹۱۱ء
حرم میں جب نہ اس بت کی ہمیں صورت نظر آئے

یہاں پاسِ ادب ہے اور وہ بت محوِ خود بینی
جو یہ صورت ہو تو بتلاؤ کیوں کر بات کر آئے

ہمیشہ انتظارِ خط میں دیکھوں راہِ نامہ بر
بہت مدت کا وعدہ ہے نہ جانے کب خبر آئے

کسی کی دید پر موقوف ہے تسکینِ دل ہمدم
جو یہ امید بر آئی تو وہ امید بر آئے

وہاں ہے حورِ جنت اور یہاں ہے حسنِ جانانہ
عجب ہے کشمکش دل کی اُدھر جائے اِدھر جائے

وہ شاید آ ہی جائے خواب میں تسکینِ خاطر کو
شبِ فرقت میں جھپکی سے ہم کو خواب اگر آئے

پے تعظیم فرش راہ ہو جائے دل مضطر
کسی شب بھی اگر وہ شوخ رعنا گھر تک آ جائے

شب مہ میں کبھی وہ بام پر سوئے جو بے پردہ
اتر کر اس کی پابوسی کو گردوں سے قمر آئے

یہ مانا ہیں نے اے اوتار مینوشی نہیں اچھی
نہ ہو بادہ تو لطف بزم کیا اے بیخبر آئے

قطعہ

کوئی بھی وجہ رنجش اے دلربا نہ پائی | سو بار ہم نے سوچا اپنی خطا نہ پائی
دیدار دلربا کی جبتک دوا نہ پائی | فرقت کے عارضے سے ہمنے شفا نہ پائی
سو بار آزمایا سو بار ہم نے جانچا | اکثر بتوں کو دیکھا بوئے وفا نہ پائی
گو لاکھ ہمنے ڈھونڈھا سب رائیگاں تھی کوشش | حد تیری صنعتوں کی اے کبریا نہ پائی
ان گلرخوں میں ہم نے پائی نہ بوئے الفت | رنگ وفا نہ پایا چشم حیا نہ پائی

اوتار شاعروں سے بزم سخن میں کہدو
شاعر وہ کیا کہ جس نے طبع رسا نہ پائی

قطعہ

جور سہ کر وفا کرے کوئی | ہے یہ مشکل تو کیا کرے کوئی
آشنائی کا دم بھرا اے دل زار | نا آشنا سا ہوا کرے کوئی
آشنائے وفا نہیں دنیا | کس سے شرح وفا کرے کوئی
اس کے کوچہ میں ٹھوکریں کھا کر | حق الفت ادا کرے کوئی

لبِ خاموش پہ کب جور کی فریاد آئی
۱۹۱۱ء دل سے نکلی ہے دُعا ان کی اگر یاد آئی

چشمِ گریاں سے ٹپکتا ہے جو دل خوں ہوکر
ہو نہ ہو اس کو کوئی شوخ نظر یاد آئی

کبکِ دل کو کسی پہلو نہیں آتا ہے قرار
جب سے اس کو تری اے رشکِ قمر یاد آئی

نہ لیا راہِ عدم کے لئے ساماں کوئی
توشۂ راہ کی اب وقتِ سفر یاد آئی

۱۹۱۰ء کرکے آنکھیں چار ہم سے آپ کیوں شرما گئے
مدعا آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمارا پا گئے

بیکسی فرقت میں بالیں پر مرے روتی رہی
جبکہ سب احباب مجھ کو چھوڑ کر تنہا گئے

کھلکھلا کر بات بھی کرنے نہ پائی تھی بہار
جب خزاں آئی تو غنچے بِن کھلے مرجھا گئے

۱۹۱۰ء پردہ جب رُخ سے دور ہوتا ہے — مہر و مہ کا سا نور ہوتا ہے
عقل کا کچھ فتور ہوتا ہے — حسن پر جب غرور ہوتا ہے
یہ سمجھتے ہیں بت کہ ہم ہیں بھی — کچھ خدا کا ظہور ہوتا ہے

دل میں تابِ شکیب و ضبط نہیں — دیکھیے اب قصور ہوتا ہے
ہے یہ کوتاہیٔ نظر اس کی — جس کو سودائے حور ہوتا ہے

جس غزل میں ہو ذکرِ مے افتار
دل کو میرے سرور ہوتا ہے

(۱۰۸) کونسا دل ہے جو دامِ جور سے آزاد ہے
جس کو دیکھو شکوہ سنجِ شیوۂ صیاد ہے

کہہ رہا ہے اک زمانہ باقیٔ جور و ستم
آپ کے ظلموں کا قصہ ہر کسی کو یاد ہے

کرکے وعدہ بھول جانا ہے ادائے دلبری
اے حسینانِ جہاں تم کو یہ فقرا یاد ہے

جب نظر تم سے ملی ہاتھوں سے دل جاتا رہا
ہر ادائے چشمِ پرفن بانیٔ بیداد ہے

حسن کی رعنائیوں سے اہلِ دل ہیں بیقرار
نالۂ بلبل کا باعث گلشنِ ایجاد ہے

مدتیں گذریں ترا دل ہو گیا صرفِ وفا
کیوں پھر اے اقتا اِن کی یاد میں ناشاد ہے

(۱۰۹) جمالِ عارضِ رعنا ذرا دکھا تو سہی — حجابِ گیسوئے پرپیچ کو ہٹا تو سہی

ہزار بار میں رویا کیا ترے در پر — کبھی نہ تو نے کہا حالِ دل سنا تو سہی
ابھی تو آئے ہوئے جانِ من چلے جانا — زیادہ دیر جو ممکن نہیں ذرا تو سہی
ترے جمال کی حسرت میں کب سے بیٹھا ہوں
اگر یہاں نہیں آنا، نہ آ۔ بلا تو سہی

دل کم حوصلہ الفت کے ناقابل نہ بن جائے
کہیں یہ جادۂ منزل ہی اب منزل نہ بن جائے
مذاقِ عشق ہی گم ہو نہ جائے رشکِ دشمن سے
جسے آساں سمجھتا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے
رُخِ انور ترا جب غیرتِ صد مہرِ تاباں ہو
ہمارا داغِ دل پھر کیوں مہ کامل نہ بن جائے
نہ ہونا بام پر بے پردہ شب کو مجھ کو یہ ڈر ہے
کوئی انجم نہ ٹوٹے اور رُخ کا تل نہ بن جائے
الٹ دینگے مذاقِ عشق و شوقِ دید سب پردے
مگر بیتابیِ دل پردۂ حائل نہ بنجائے
نہیں ممکن کہ ہو وہ آشنائے لذتِ الفت
دلِ عاشق کہ جب تک درد کا حامل نہ بن جائے
جب اے آقا تمارو رونق فروزِ بزمِ دشمن ہو — تو پھر کیوں شمعِ محفل سوزِ آہِ دل نہ بن جائے

غ ۱۹

ارض و سما میں تو ہے ہر سمت چار سو ہے
افسوس چشمِ ناقص ناکامِ جستجو ہے

تو کھول چشمِ حق بیں اور دیکھ اس کے جلوے
کیوں ڈھونڈھتا کدھر ہے وہ تیرے روبرو ہے

شرم و حجاب کا اب حائل نہیں ہے پردہ
خلوت کدہ میں دل کے اک میں ہوں ایک تو ہے

بس مدعا یہی ہے ہو مدعا نہ کوئی
بے آرزو جو دل ہو اس دل کی آرزو ہے

خود کو مٹا اگر ہے طالب کمال کا تو
دریا میں ڈوب جانا قطرے کی آبرو ہے

ہر بات پر بگڑنا۔ ہر ایک سے الجھنا
کیا آپ کا بھی صاحب اندازِ گفتگو ہے

اک تازہ آرزو ہے ہر آرزو کا حاصل
تکمیلِ آرزو ہی آغازِ آرزو ہے

گل نے کہا بہ حسرت گلچیں کا کیا ہو شکوہ
جس نے چمن چھڑایا وہ میرا رنگ و بو ہے

افتادِ خستہ جاں پر آتا ہے رحم ہم کو
بیتابِ جستجو ہے۔ ناکامِ آرزو ہے

کیوں پوچھتے ہو۔ رند ہے یا پاکباز ہے
اوتار کچھ بھی ہو۔ وہ تو بندہ نواز ہے

اے دل نہ ڈر۔ رحیم ہے وہ کارساز ہے
عاصی کے واسطے تو درِ توبہ باز ہے

اے خضر تیری عمر یہ مانا دراز ہے
شمعِ حیات میں تری سوز و گداز ہے؟

عارض پہ منتشر تری زلفِ دراز ہے
چشمِ سحر کھلی ہے مگر نیم باز ہے

اے ناخدا بچائیو طوفاں ہی زور پر
بحرِ فنا میں عمرِ رواں کا جہاز ہے

محروم دید چشم ہے۔ دلِ جلوہ گاہِ بت
عشقِ حقیقی یہ ہے وہ عشقِ مجاز ہے

ہے محوِ خود نمائی جو ہر ذرۂ جہاں
اس میں بھی کبریائی کا تیری ہی راز ہے

ہے شانِ زہد نسبتِ عجزِ گناہ سے
تاریکیِ نشیب میں رازِ فراز ہے

گیسو الجھ رہے ہیں سلجھ کر شبِ وصال
میں محوِ اضطراب ہوں وہ محوِ ناز ہے

اوتار رکھ دے زاہدِ جنت فروش سے
میکش ہوں۔ گنہگار ہوں۔ رحمت پہ ناز ہے

دلِ دھڑکتا ہی مری جاں پہ وبال آتا ہے
جب کسی شوخ پری رو کا خیال آتا ہے

اے ہجومِ غم و حرمان نکل اب سینہ سے
خانۂ دل میں تو اب شوقِ وصال آتا ہے

شبِ وعدہ دلِ مضطر کی تسلی کے لئے
وہ نہیں آتے مگر ان کا خیال آتا ہے

بے وفا تجھ کو کبھی یاد نہ آئی میری
مجھ کو رہ رہ کے مگر تیرا خیال آتا ہے

اپنی محفل سے وہ اٹھواتے ہیں اوتار کو جب
بن کے اک شکلِ غم و رنج و ملال آتا ہے

پوچھنا ہے یہ عبث کیا یہ سوال اچھا ہے
آپ یکتا ہیں اگر ماہِ کمال اچھا ہے

تو کبھی پاس نہ بیٹھا شبِ تنہائی میں
بیوفا تجھ سے تو تیرا ہی خیال اچھا ہے

سعی و تدبیر مجت ہیں ہمہ لاحاصل
کارِ آساں سے تو دشوار و محال اچھا ہے

یہ تو ناکام ہے اور اس کو رسائی ہو نصیب
حسنِ تدبیر سے تو حسنِ خیال اچھا ہے

موجبِ عفو ہو تقصیر اگر تو اچھی
باعثِ یادِ خدا ہو تو ملال اچھا ہے

دل لیے جاتے ہو لے جاؤ تمہاری مرضی
ہاں مگر اتنا تو کہہ دو کہ یہ مال اچھا ہے

روح پہ بارِ گراں ہے اقتدارِ مگر
مر کے چھٹ جانے سے جینے کا وبال اچھا ہے

۱۹۰۶ء

جادہ فگن ہے شاہدِ رعنا کہیں جسے
اہلِ نگاہ دل کی تمنا کہیں جسے

وہ کام ہی نہ کیجیے بیجا کہیں جسے
وہ بات ننگِ عشق ہو شکوہ کہیں جسے

ہم اس کو کیا کریں ستم آرا کہیں جسے
اسکی طلب ہے جان سے پیارا کہیں جسے

اپنی نگاہ طالبِ حسنِ لطیف ہے
دل میں جگہ ہے اسکی دل آرا کہیں جسے

فطرت تری حجاب ہے اے حسن کس لیے
وہ شمع بن کہ انجمن آرا کہیں جسے

اے شوخ میرے اشکِ تمنا کی قدر کر
یہ وہ گہر ہے آنکھ کا تارا کہیں جسے

کشتیِ عمر بحرِ حوادث میں ہے رواں
اور مرگ وہ ہے اس کا کنارا کہیں جسے

اٹھ جائے یہ تو دیکھ لیں وہ جلوہ لطیف
غفلت نے ڈال رکھا ہے پردا کہیں جسے

اوتار دوست نام کے دنیا میں ہیں بہت
ایسا مگر کوئی نہیں اپنا کہیں جسے

۱۹۰۶ء

خود بھی ستم اٹھائے دلِ پائمال نے
مجھ کو بھی مبتلا کیا اس خستہ حال نے

ہر چند تھا حجاب میں وہ حسنِ دلفروز
تصویر کھینچ لی مرے جوشِ خیال نے

یاد آئیں دیکھ کر اسے قدرت کی صنعتیں
حق آشنا کیا ترے حسن و جمال نے

یہ کہہ کے بزمِ ناز سے مجھ کو اٹھا دیا
ہم چاہتے ہیں باغ سے کانٹے نکالنے

افسوس شعر کہنے سے بدنام ہو گیا
رسوا کیا جہاں میں مجھے اس کمال نے

اوتار گو تھی ہجر میں مایوس زندگی
مرنے دیا نہ آپ کو شوقِ وصال نے

(۱۹۲۷ء)
یہ نہ تم سمجھو کہ ہم مارے سے ٹل جائیں گے
گھر سے نکلے بھی اگر در پہ مچل جائیں گے

واعظو ذکرِ مے خلد عبث کرتے ہو
ہم کوئی شیخ نہیں ہیں جو بہل جائینگے

جانِ من تم نہ نکالو مرے دل کے ارماں
آہیں بن بن کے کبھی خود یہ نکل جائینگے

وہ نہیں ہم جو کریں تیرے ستم کا شکوہ
لب تک آئیگا تو کچھ کہہ کے بدل جائینگے

شب وعدہ جو سلجھ جائیں گے ان کے گیسو
میری تقدیر کے سب بل بھی نکل جائینگے

آپ مقتل میں پشیماں جو ہوئے جاتے ہیں
سر کہاں چھوڑنے مشتاقِ اجل جائینگے

آج کل حضرتِ اوتار ہیں بد مستِ شباب
دیکھئے گا کوئی دن میں یہ سنبھل جائینگے

(۱۹۲۷ء)
رند ہیں سرشار - دورِ جام ہے
بدنصیب اوتار تشنہ کام ہے
بدنصیبی اس کی دیکھا چاہئیے
جو سرِ ساحل بھی تشنہ کام ہے
ہوں ازل سے خوگرِ رنج و محن
عیش و راحت سے مجھے کیا کام ہے

بے وفاؤں سے وفا کی آرزو
حضرتِ دل یہ خیالِ خام ہے

کل کی ہے کس کو خبر اے زاہدو
آج تو ساقی ہے دورِ جام ہے

دن کو زاری۔ رات کو آہ و فغاں
عشقِ خوباں کا یہی انجام ہے

حشر تک جس کی سحر ہوتی نہیں
وہ مری ناکامیوں کی شام ہے

پرخطر ہر گام راہِ عشق میں
مرگ لیکن منزلِ آرام ہے

ابتدائے عشق سے ہوں بیخبر
یہ نہیں معلوم کیا انجام ہے

ہندو مسلم ہیں سب بندے ترے
ان کا ہے رحمان ان کا رام ہے

دامنِ رحمت میں ہیں رحمان کے
رام والوں کو بہت آرام ہے

جانئے رحمان ہی کو رام بھی
آپ کا رحمان میرا رام ہے

کیا بتائیں ان کو اے اوتار ہم
پوچھتے ہیں کیا غرض۔ کیا نام ہے

کرم کے بدلے ستم کرینگے۔ وفا کے بدلے جفا کریں گے ۱۹۳۳ء
وہ ہم کو رسوا تو کر چکے ہیں۔ اب آگے دیکھیں وہ کیا کریں گے

نہ ہو گا اپنا مقام باقی۔ نہ ہو گا کوئی نشان باقی
چمن اجڑ جائے گا جب اپنا تو پھر وہ ہم کو رہا کریں گے

ستالیں جتنا وہ چاہیں ہم کو۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیں
ستانا اچھا نہیں کسی کا۔ ستائینگے تو برا کریں گے

ستم کریں گے وہ جتنا ہم پر کرینگے اُتنا ہی ہم بھی سر خم
وہ گالیاں جتنی دیں گے اتنی ہم ان کے حق میں دعا کرینگے

جہاں میں پابند دیر کوئی۔ کوئی اسیرِ حریمِ کعبہ
تمہارے عاشق اگر کریں گے۔ تمہارے در پر صدا کریں گے

وہ ہم کو خلوت میں مل گئے بھی تو پھر بھی ہو گا نہ وصل حاصل
کبھی ہم ان سے گلہ کریں گے۔ کبھی وہ ہم سے حیا کریں گے

ہمارے لب پر ہیں کتنے شکوے۔ ہمارے دل میں ہیں کتنی حسرت
کبھی تو آئیں گے ایسے بھی دن کہیں گے ہم وہ سنا کرینگے

ستائینگے بیکسوں کو جو ان کو ہو گی حاصل کبھی نہ راحت
زمانہ ان کو برا کہے گا۔ برے بنیں گے برا کریں گے

خدا ہی سمجھے گا ان سے اوتار ان پہ لعنت خدا کی ہو گی
جو بے شعور ایسے کافروں کو مقرر اپنا خدا کریں گے

نادم کیا ہے ہم کو اس دل کی آرزو نے
محشر بپا کیا ہے اک قطرہ بھر لہو نے

سچ کہہ رہا ہوں صاحب بدنام ہو رہے ہو
رسوا کیا ہے تم کو بیباکئ عدو نے

دیوار و در کو دیکھا حسرت سے وقت رحلت
ناکام آرزو نے بیتاب جستجو نے

اپنا نا غیر کو اور دشمن کو دوست کرنا
سکھلا دیا ہے ہم کو انداز گفتگو نے

یاد آ گئی تمہاری صحن چمن میں ہم کو
آنکھوں سے خون لایا ہر گل کے رنگ و بو نے

مونہ تکتے رہ گئے ہم اوتارِ انجمن میں
دل لے لیا ہمارا اس شوخِ خوبرو نے

کوئی ارماں نہیں نکلا کوئی حسرت نہیں نکلی ۱۹۲۹ء
ہمارے دل سے جب نکلی تو آہِ آتشیں نکلی

ترے ملنے کی جب کوئی نہ صورت مہ جبیں نکلی
تڑپ کر دردِ فرقت سے مری جانِ حزیں نکلی

بہت ڈھونڈھا حرم میں دیر میں لیکن نہیں پایا
جھکایا سر جو سجدے میں وہ صورت دلنشیں نکلی

ترے تیرِ نگاہِ ناز کا احساں ہے بسمل پر
لبِ زخمِ جگر سے مرحبا اور آفریں نکلی

ہماری کشتیِ عمرِ رواں بحرِ حوادث میں
کہیں بیٹھی کہیں ابھری کہیں ڈوبی کہیں نکلی

مرے زورِ تصور نے مجھے دھوکے دیے کیا کیا
سیاہی بختِ بد کی بن کے چشمِ سرمگیں نکلی

ہے جیسے آسماں پر ماہ افضل سب ستاروں میں
یونہی سارے حسینوں میں وہ صورت بہتریں نکلی

مجاز اور وہ طلسمِ رنگ و بو وہمِ نظر ٹھہرا

حقیقت میں نگاہِ دل نگاہِ دوربیں نکلی

قمر بن کر بروئے چرخ میرا داغِ دل نکلا
شبِ دیجور بن کر اس کی زلفِ عنبریں نکلی

نہ دیکھو ہم کو دزدیدہ نگاہوں سے نہ تم دیکھو
تمہاری دل لگی ٹھہری۔ یہاں جانِ حزیں نکلی

ترا جانا قیامت تھا۔ کہ سر پر آسماں ٹوٹا
میرے پاؤں تلے سے اضطرابی میں زمیں نکلی

سنا جب بھی تجھے ہم نے۔ نہیں۔ کہتے سنا ظالم
کبھی بھولے سے ہاں بھی تیرے مونھ سے نازنیں نکلی

حقیقت میں ہے دل حسنِ ازل مستور کیوں ہوتا
نظر سے دور تھی تصویر جو اس کے قریں نکلی

رہا اوتار ناکامِ تمنّا آخری دم تک
کوئی ارماں نہیں نکلا۔ کوئی حسرت نہیں نکلی

کیا غرض ہے نام سے انعام سے اکرام سے
کام کرتا کام تیرا۔ کام رکھ تو کام سے

چھوڑ دے حاصل کو اور سود و زیاں کی فکر کو
فرض اپنا جان کر تو کام کر آرام سے

عشقِ صادق۔ حسنِ کامل میں نہیں کوئی تمیز
ایک روحانی ہے قوت نامزد دو نام سے

جب کہ اپنی ابتدا ہی سے نہیں تو آشنا
بہرہ ور ہو گا بتا پھر کس طرح انجام سے

یہ خودی انساں کی ہے باعثِ ہر رنج و غم
"میں ہوں" "میں کرتا ہوں" باز آ اس خیالِ خام سے

جب تک اے غمخوار اس دنیا میں ہے تیرا قیام
بچ کے جائے گا کہاں تو گردشِ ایام سے

ہٹا دے جو پردہ خودی کا پڑا ہے — خدا کو اگر دیکھنا چاہتا ہے ۱۹۲۶ء
کبھی رائیگاں تیری نیکی نہ ہو گی — بدی کا نتیجہ ہمیشہ برا ہے
سنا لے فلک ہم کو تو جتنا چاہے — مگر یاد رکھ بیکسوں کا خدا ہے
قناعت سے حاصل ہے تسکین مجھ کو — نہ اس کی شکایت نہ اسکا گلا ہے
وفا کی تو امید کرنا ہے کس سے — یہ دنیا تو نا آشنائے وفا ہے

زیادہ کا لالچ نہ غمخوار کر تو
بہت ہے خدا نے جو تجھ کو دیا ہے

مزاج حسن میں رغبت کبھی ہے نفرت ہے ۱۹۲۷ء
زبانِ حسن پہ ہر دم پیامِ الفت ہے

نہ دیکھ پائے گا تو عکس جلوۂ جاناں
خودی کی آئینۂ دل میں گر کدورت ہے

محبت اتنی سمائی ہے دل میں اس بت کی
جدھر بھی دیکھتا ہوں سامنے وہ صورت ہے

گلہ عبث ہے ترا تو جو کامیاب نہیں
رہِ طلب میں تو کوشش کی بھی ضرورت ہے

مدد غریبوں کی اور بے کسوں کی کر ہر دم
یہی ہے آدمیت اور یہی شرافت ہے

خدا کے بندوں کو کر پیار ان کی خدمت کر
یہی خدا کی عبادت۔ خدا کی خدمت ہے

تمہارا حسن وہ ہے جس سے عشق پیدا ہو
ہمارا عشق وہ جس سے تمہاری شہرت ہے

جو حسن و عشق میں ہے امتیاز مٹ جائے
اسی کا نام ہے الفت یہی محبت ہے

# گل دستہ

پنڈت اوتار کرشن تکو اوتار

(ہمدرد پریس دہلی)

# فہرستِ مطالب

# پیش لفظ

مہذب سماج میں کلچر کی ہمہ گیری کا ثبوت یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے افراد اپنے مشاغل اور تعلیم و تربیت کی خصوصیت کے باوجود ذوق اور شعوری دلچسپی میں ہم آہنگ ہوں۔ جن نظموں پر یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔ وہ اس شخص کے ذہن کی پیداوار ہیں جس کی تعلیم سائنس کے مضامین میں ہوئی۔ اور زندگی بھر جس کا شغل بھی ایسے صیغے میں رہا جسے ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن چونکہ جناب اوتار کی پیدائش اور تربیت ایسے خاندان میں ہوئی تھی جس پر ہندوستانی کلچر کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کے والد مرحوم پنڈت کرشن صاحب اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ اس ماحول میں اوتار۔

صاحب کے ذہن میں ادبی پس منظر جلوہ افروز رہا جس کا عکس ان نظموں میں دیکھا جاتا ہے۔

اس مجموعے کے مندرجات کی فہرست ہی صاف بتا رہی ہے کہ شاعر کی طبیعت کا رجوع خارجیت کی طرف زیادہ ہے اور یہ بدیہی نتیجہ ہے سائنسی تعلیم کا۔ چونکہ کلچر اور ابتدائی تربیت مضبوط ذہنی پس منظر بنا چکی تھیں ادبیت ذہن سے وابستہ رہی۔ اوتار صاحب کا ذوق شعری بہت ستھرا اور لطیف ہے اور وہ جبھی شعر کہتے ہیں جب دل میں آتا ہے۔ اسی لیے جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں۔ اول تو ان کی طبیعت داخلیت کے کونے کھدروں میں جھانکتی بھٹکتی نہیں اور پھر یہ کہ وہ دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں وہ محض لکھنے کے لیے نہیں لکھتے اسی لئے ان کے کلام میں جان ہے۔ دلکشی ہے۔ نہ وہ آورد کے کنوڈے ہیں اور نہ انہیں اتنی فرصت ہے کہ کہتے ہی چلے جائیں اور کوئی موضوع چھوڑیں ہی نہیں اور نہ ان کا مذاق عامیانہ ہے۔ تصنع اور تکلف کے لوث سے ان کا کلام پاک ہے۔ ان کے ہاں نہ بلند آہنگی کے غلغلے ہیں نہ بے چارگی اور مایوسی کے مرثیے۔ ایک قسم کی خود اعتمادی کلام پر حاوی ہے جو ان کی وسیع وقار اور ذہن کی عظمت کا پتہ دیتی ہے۔

جو موضوع ان کی نظموں کے ہیں وہ نئے نہیں لیکن ان کا طرزِ ادا نہایت شگفتہ ہے اور اسلوب تازگی اور لطافت میں ڈوبا ہوا ہے ادب میں ندرت

اسی کا نام تو ہے ورنہ جو لوگ نئی بات اور انوکھے موضوع کے پیچھے بھٹکتے رہے ہیں، اکثر بری طرح ٹھوکر کھاتے ہیں۔

اوتار صاحب کے خیالات نہایت پاکیزہ ہیں۔ ان کا اسلوب زوردار اور دل فریب ہے۔ زبان سلیس اور فصیح ہے۔ ہر نظم رواں دواں ہے۔ غزلیں بھی انھوں نے خاصی تعداد میں کہی ہیں۔

اوتار صاحب امرتسر کے ایک معزز کشمیری پنڈت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار پنڈت کرتار کرشن ٹکو پنجاب کے نامی تحصیلداروں میں تھے۔ آپ کے ایک جد امجد دیوان نند رام کابل میں وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ اوتار صاحب ۱۹۰۴ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اور میٹرک سے فراغت پا کر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۴ء میں انگلستان چلے گئے وہاں نہایت کامیابی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری انجینیرنگ میں لی اور ہندوستان آکر دوران ملازمت میں آیم۔ آئی۔ ای امتیاز حاصل کیا فوراً بنگال ناگپور ریلوے نے آپ کی خدمات محفوظ کیں۔ اس وقت آپ ڈسٹرکٹ انجنیر کے معزز عہدے پر فائز ہیں اور صدر مقام ناگپور ہے ۱۹۳۵ء میں آپ پھر یورپ کی سیر کو گئے اس سفر میں آپ کی رفیقۂ حیات ہمراہ تھیں۔ شعر سے دلچسپی آپ کو ازل سے تھی اور ذہن ادبی مذاق سے آراستہ تھا۔

میرے خیال میں **گلدستہ** اردو نظم کے خزانے میں قیمتی اضافہ ہے جس

کے لیے سب کو آوتار صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے۔ انھوں نے یہ اچھا کیا کہ اپنی رفیقۂ حیات کی ایک نظم بھی اس مجموعے میں شامل کر دی جو کتاب کے آخر میں ملے گی۔ خاتون مرحومہ نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا اچھا ہوتا اگر اس میں سے کچھ اور بھی اس گلدستہ کی زینت ہوتا۔

برجموہن دتاتریہ کیفی

لائل پور

۲۶۔ اپریل ۱۹۴۷ء

# دنیاوی دوست

دوستی دنیا میں ہے حاجت روائی کے لئے
بے وفائی کے لئے اور کج ادائی کے لئے
کچھ بھلائی بھی اگر ہے تو برائی کے لئے
آشنائی ہے فقط نا آشنائی کے لئے
کون ہے وہ جس نے دنیا میں دغا دیکھی نہیں
مطلبی بندے جو ہیں ان میں وفا دیکھی نہیں
دوست دنیاوی رکابی کے ہیں یا ہیں جام کے
وقت پر جب یہ نہ کام آئیں تو پھر کس کام کے
جب تلک ان کو ہو غرض خادم ہیں یہ بے دام کے
جب بلا سر سے ٹلی واقف نہیں پھر نام کے

دوستی مطلب کے بندوں کی ہے سچ پوچھو بری
ہے بجا کہئے غرض مندوں کو گر میٹھی چھری

سُن چکا قصے کہانی اور تاریخیں سبھی
اور شہادت دے رہا ہے روز کا بیوپار بھی

جو بنا پھرتا ہے یارِ خیر جو تیرا ابھی
دیکھنا تجھ کو دغا دے گا وہ موقع پر کبھی

آج جس کو ایک کے قدموں پہ دیکھا سرنگوں
کل اسی کا حال ہوگا اس کے ہاتھوں سے زبوں

جس کو خالق سے عطا ہو عزّ و جاہ و اقتدار
صرف کرنے کو ہو جس کے پاس دولت بے شمار
اُس کے بن جاتے ہیں مونس سینکڑوں کیا ہزار
جس سے پوچھو وہ کہے گا یہ مِرا اچھا ہے یار

مبتلائے پنجۂ افلاس کوئی ہو اگر
بات تو جب ہے کہ اس دم ہو نظر امداد پر

گر کسی کا کوئی ہمدم ہم نفس غم خوار ہو
اور اس کو اس سے الفت ہو محبت پیار ہو
وقت پر کام آئے اس کے اس طرح کا یار ہو

جان تک موقع پہ دینے کے لئے تیار رہو
تو اسے کہنا بجا ہے اس کا یارِ باوفا
ورنہ دنیا میں نہیں کوئی کسی کا آشنا

جو مسرت کے زمانہ میں نبھائے یار سے
اور وہ اس کو مصیبت میں چھڑائے یار سے
رنجشِ بے جا پہ رُخ اپنا پھرائے یار سے
جب ٹلے آفت تو پھر الفت بڑھائے یار سے
اس طرح کی دوستی اے دوستو کس کام کی
دوستی اس عہد میں اب رہ گئی ہے نام کی

کون قائل دوستی کے کون سچا یار ہے
کس کو کہنا ہے بجا یہ مونس و غم خوار ہے
کس کے دل میں ہے محبت کس کے دل میں پیار ہے
کون سچا مخلص و ہمدرد اے اقرار ہے
جو رفیقِ یار ہو تکلیف میں بھی یار کا
سمجھ یہی ہے بس یہی انداز اک غمخوار کا

# چاند

منظورِ کبکِ دل سے ملاقات چاند کی
ہستی ہو کیوں نہ دافعِ ظلمات چاند کی
واللہ اس جہان میں ہے کیا بات چاند کی
کیوں کر بیاں کروں میں عنایات چاند کی
ٹھنڈی سہانی ہوتی ہے کیا ذات چاند کی
بھاتی ہے کبکِ دل کو بہت رات چاند کی

گو چیرخ پرستاروں کا سردار چاند ہے
اور عکسِ آفتاب کا اظہار چاند ہے
میری نگاہ میں تو رُخِ یار چاند ہے
پُر داغ جس کو دیکھ کے ہر بار چاند ہے

ٹھنڈی سہانی ہوتی ہے کیا ذات چاند کی
بھاتی ہے کبک دل کو بہت رات چاند کی

ہوتا ہے وقتِ شام عیاں آسمان پر
رہتا ہے جلوہ ریز یہ سارے جہان پر
پڑتی ہے اس کی روشنی ہر اک مکان پر
مرتا ہوں اے مسافرِ شب تیری شان پر

ٹھنڈی سہانی ہوتی ہے کیا ذات چاند کی
بھاتی ہے کبک دل کو بہت رات چاند کی

کچھ دن ہوئے تو شکل تھا اک خورد سال کی
اب رفتہ رفتہ بن گیا صورت کمال کی
تعریف کیا کروں ترے حسن و جمال کی
پیش نظر ہے شان کمال و زوال کی

ٹھنڈی سہانی ہوتی ہے کیا ذات چاند کی
بھاتی ہے کبک دل کو بہت رات چاند کی

خاص اس کا وصف ہے کبھی کم سن کبھی جواں
کیا کیا ہے دل فریب ترا چاند آسماں
اس کے طلسم حسن کا میں کیا کروں بیاں

یہ جلوہ گر کبھی کبھی نظروں سے ہے نہاں
ٹھنڈی سہانی ہوتی ہے کیا ذات چاند کی
بھاتی ہے کبک دل کو بہت رات چاند کی

# موسم سرما

گئے وہ دن کہ مارے دھوپ کے ہر ایک بے دم تھا
دماغ انسانیت کا شدتِ گرمی سے برہم تھا
بھبکے لو کی بیتاب اور مضطر ایک عالم تھا
گلے چشموں کے سوکھے تھے لب جو تھا تو بے نم تھا

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ شدت جسم میں کم ہے

جو پھولوں کی طرح کملائے تھے گرمی کی شدت سے
جو تھے ناآشنائے راحت و آرام قدرت سے
نہ بیٹھے چین سے دن کو نہ سوئے شب کو راحت سے
زمستاں کو سمجھتے ہیں وہ بہتر آج جنت سے

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حرارت جسم میں کم ہے

جو خورشید قیامت تھا وہ مہر خوشگوار اب ہے
جلاتا تھا تپش سے جو غریبوں کو وہ یار اب ہے
امیروں کے گھروں میں پوستینوں کا سنگار اب ہے
وصالِ دخترِ رز سے شادماں سر بادہ خوار اب ہے

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حرارت جسم میں کم ہے

زمستاں سلطنت تیری جو اب معمور ہوتی ہے
غبار آلود منظر سے کثافت دور ہوتی ہے
جو تھی پژمردگی چہروں پہ اب کافور ہوتی ہے
مئے فرحت سے چشمِ منتظر مخمور ہوتی ہے

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حرارت جسم میں کم ہے

زمستاں تو نے عالم کو بخشا فیضِ عالم اپنا
تری تاثیر سے یخ ہو گیا بہتا ہوا دریا
مگر تیری فضا میں ہے مگن وہ طفلِ بے پروا

جو فرشِ برف پہ سرگرم مشق رقص ہے تنہا

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حدت جسم میں کم ہے

جوانوں کو ہوائے فرحت آسا تیری بھاتی ہے
زیادہ کام کر سکتے ہیں گہری نیند آتی ہے
جو کہنہ سال ہیں ان کو فقط سردی ستاتی ہے
ہوائے سرد سے تو روح ان کی کانپ جاتی ہے

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حدت جسم میں کم ہے

سفیدی برف کی چھائی ہوئی ہے ہر جگہ ہر سو
کہاں اب وہ تپش گرمی کی ہے اور اب کہاں وہ لو
نقاب رخ بنائے ہے دوشالے کو ہر اک مہرو
بس اے اوتار بہتر ہے زباں کو بند کر لے تو

گئی گرمی کی شدت آج کل سرما کا عالم ہے
پسینے کے گئے دن جوشِ حدت جسم میں کم ہے

# تین ہستیاں

شبنم

(۱)

عارضِ گل چومنے کو آسماں سے آئی ہوں
رونمائی کو دُرِ اشکِ تمنا لائی ہوں
میری ہستی تھی مثالِ دُودبارِ چرخ پر
گِر کے پھولوں پر ٹپکتی ہوں میں ہم شکلِ گہر
میری پستی سے سبق حاصل کریں اہلِ نظر
گل رخوں کے پاس کب رہتی نہ گرتی میں اگر
چشمِ عاصی میں اگر اشکِ ندامت آگیا
ذاتِ حق میں مِل گیا وہ لطفِ حق کو پا گیا
اپنی ہستی کو مٹا کر جو فنا ہو جائے گا
تو ندامت کا دُرِ آبِ بقا ہو جائے

۱ اختر

۲

جلوۂ صبحِ ازل ہوں حسن کی تنویر ہوں
خالِ نور افشاں ہوں زیبِ روئے چرخِ پیر ہوں
ہوں چراغِ محفلِ فردوس بامِ اوج پر
میں وہاں ہوں جس جگہ مشکل کسی کا ہو گذر
میری ہستی سے زمانہ پر یہ ہوتا ہے عیاں
ہے بلندی پر پہنچنا ہی چمکنے کا نشاں
راہگیروں کا شبِ تاریک میں ہوں راہبر
مجھ کو تکتے ہیں شبِ غم تیرہ قسمت رات بھر
ماہِ تاباں کب ضیا بخشِ جہاں ہر رات ہے
میری ہستی تو ہمیشہ دافعِ ظلمات ہے

شاعر

۳

قربتِ گلفام سے شبنم کا دل مسرور ہے
آسماں پر اخترِ تاباں چراغِ طور ہے
خاکساری سے امیدِ رحمتِ مولا اسے
سرفرازی اور دلِ افروزی کا ہے دعوا اسے
اپنی پستی پر زمانے بھر میں اس کو ناز ہے

محفلِ گردوں میں اس کی منزلت ممتاز ہے
دعوئ شبنم ہے کیا اور دعوئ اختر ہے کیا
شاعرِ دِل گیر تو اوتار یہ ہے جانتا

راہِ اُلفت میں یہ دونوں ہم قدم ہمراہ ہیں
اشک ہائے چشم تر وہ یہ شرارِ آہ ہیں

# گرمی کے دن

سنہ ۱۹۲۳ء

گرمی وہ پڑ رہی ہے کہ نالاں ہے اک جہاں
تپتی ہے وہ زمین کہ بھٹی کا ہے گماں
برسا رہا ہے آگ قیامت کی آسماں
چھالے زباں پہ پڑتے ہیں اس کا وہ ہے بیاں
ٹھنڈی بھی سانس لی تو شرر کا اثر ہوا
جل کر کباب سینہ میں ہر اک جگر ہوا

اب تشنہ کامیوں کی شکایت کہاں نہیں
تالاب کے کنارے ہجومِ بتاں نہیں
سبزے کا صحنِ باغ میں نام و نشاں نہیں
دریا میں ریگ رہ گئی آبِ رواں نہیں

ہر داغ جل بھلس کے شرر بار ہوگیا
اب دل کا کل معاملہ فی النار ہوگیا

وہ لُو چلی کہ باغ کو ویران کر دیا
عشرت کدہ جو تھا اسے سنسان کر دیا
دن کو تو سخت دھوپ نے حیران کر دیا
حبسِ ہوا نے شب کو پریشان کر دیا
کٹتے نہیں ہیں کاٹنے سے یہ دن پہاڑ کے
چھوڑیں گے بوستانِ جہاں کو اجاڑ کے

رستہ میں راہگیر بھی اب نوردان نہیں
دیکھا تو کاروان کا کہیں بھی نشان نہیں
ہمت ہے پست دل میں وہ تاب و تواں نہیں
اور اس پہ قہر یہ ہے کہ پانی وہاں نہیں
مایوس و نامراد مسافر غریب ہے
چھوٹے سے ایک درخت کا سایہ نصیب ہے

مسرور و محوِ عیش و طرب ہر امیر ہے
جو خوابگاہ اس کی ہے جنت نظیر ہے
جس خانۂ نشاط میں راحت پذیر ہے

ناواقفِ تمازتِ مہرِ منیر ہے
پنکھا قفس پہ اپنا ہے غصہ اتارنا
رکتا ہے وہ غریب تو ظالم ہے مارنا

انسان زندگی سے بھی بیزار ہوگیا
حیوان جو آگیا یہاں بیمار ہوگیا
طائر بھی وقفِ سایۂ اشجار ہوگیا
نالاں فلک کے جور سے اوتار ہوگیا

گرمی سے بے قرار ہر اک بے زبان ہے
ذی فہم جو ہے اسکی تو آفت میں جان ہے

# ہندوستان

سنہ ۱۹۳۲ء

لازم مری زبان کو اس کا بیان ہے
ہندوستان کی خاک تو جنت نشان ہے
جو ذرہ اس زمین کا ہے آسمان ہے
وہ مدح خواں ہے جس کے دہن میں زبان ہے

اس کی بڑائی چھوٹے بڑے سب ہیں مانتے
سمجھیں کہ کچھ نہ سمجھیں مگر سب ہیں جانتے

اہلِ زباں کی سحر بیانی یہاں ہوئی
ہندو دھرم کی نور فشانی یہاں ہوئی
گنگ و جمن کی آب روانی یہاں ہوئی
تہذیب پرورش سے سیانی یہاں ہوئی

ہر فن میں باکمال تھے ہر علم پر عبور
اہلِ ہنر کا نام تھا مشہور دُور دُور
ویدانت کے تھے ہند میں جھنڈے گڑے ہوئے
اور فلسفی یہاں کے بڑے سے بڑے ہوئے
اشعارِ سنسکرت میں ہیں موتی جڑے ہوئے
افلاکِ اقتدار پہ تھے سب کھڑے ہوئے
سارے جہان کے لئے اک درس گاہ تھا
اس کی سرشت پاک تھی دور از گناہ تھا
ہے کون جانتا نہیں جو نام رام کا
اور سیتا رانی غیرتِ ماہِ تمام کا
گھر گھر ہے چرچا بنسری والے شیام کا
گیتا نمونہ جس کے ہے شیریں کلام کا
مدت گذر گئی ہے وہی سیتا رام ہے
ہندوستان میں وہی "جے رادھے شام" ہے
ارجن کی ہر زبان پہ ہے ناوک افگنی
اور بھیم سین کی وہ شجاعت وہ مردمی
بھیشم پتامہ سورما دُھن قول کا دھنی

اپنی ریاضتوں سے اجل جس نے بس میں کی
اس سرزمیں سے پیدا رشی مہرشی ہوئے
کپل وشِشٹ و بیاس کئی فلسفی ہوئے

اکبر سے بادشاہ کا یہ ہند تھا وطن
حبِ وطن تھا جس کی ہر اک رگ میں جوش زن
تھے بیربل سے اہل خرد زیبِ انجمن
تھے زیب بزم کون و مکاں جس کے نو رتن
نورِ جہاں کا حسن جہانگیر دیکھئے
اور آگرہ میں تاج کی تعمیر دیکھئے

اک وہ زمانہ تھا کہ یہاں بھی بہار تھی
ہندوستاں پہ رحمتِ پروردگار تھی
عظمت جہاں پہ ہندیوں کی آشکار تھی
مخلوقِ ہند امن میں لیل و نہار تھی
ہندوستاں تھا غیرتِ جنت بنا ہوا
اس بوستاں کا پھول تھا ہر اک کھلا ہوا

ہر وقت حبِ قوم سے لبریز جام تھا
سرشار جامِ عشقِ وطن خاص و عام تھا

تحصیل سے کمال کی جنت مقام تھا
ہندوستاں کا سارے زمانے میں نام تھا
ہندوستان کیا تھا کہ جنت نشان تھا
فردوس کا زمین پہ اکثر گماں تھا
لیکن ہزار حیف کہ وہ دن گذر گئے
جتنے چڑھے تھے نظروں پہ اتنے اتر گئے
دشمن نشاط و عیش کا دامن کتر گئے
ہندوستاں کے چاہنے والے ہی مر گئے
صد حیف آفتاب ترقی کا ڈھل گیا
قسمت بدل گئی وہ زمانہ بدل گیا
ہندوستاں کی دہر میں عزت نہیں رہی
وہ شان وہ شکوہ وہ عظمت نہیں رہی
مسلم میں اور ہندو میں الفت نہیں رہی
اب ہندیوں میں چشمِ مروّت نہیں رہی
اہل ہنر یہاں ہیں نہ اہل کمال ہیں
گردش سے آسمان کی سب پائمال ہیں
ہندو یہاں کے ہیں تو مسلماں یہاں کے ہیں

ساکن یہ دونوں ایک ہی ہندوستاں کے ہیں
سچ پوچھئے تو پھول اسی بوستاں کے ہیں
لیکن چمن میں جھگڑے نہ جانے کہاں کے ہیں

وہ اس کی اور یہ اس کی نگاہوں میں غیر ہے
دیکھو سمجھ کہ بھائی کو بھائی سے بیر ہے

ہندوستان سے اڑ گئی اب بوئے اتفاق
پائی عروسِ حُبِ وطن نے یہاں طلاق
اہل ہنر کوئی نہیں اب اور نہ با مذاق
فردوسِ اتفاق بنا دوزخِ نفاق

بھارت ورش کے پھولوں کا خرمن اجڑ گیا
ہندوستان کے باغ کا نقشہ بگڑ گیا

# عید مبارک

سنہ ۱۹۳۴ء

کتنی سرور بخش مہ نو کی دید ہے
گنجِ طرب کے قفل کی گویا کلید ہے
مسلم برادروں کا یہ روزِ سعید ہے
وہ انبساط ہے کہ نہ دید و شنید ہے
ایسی ہلالِ عید کی مقبول دید ہے
ہر ایک نغمہ زن ہے ہر اک گھر میں عید ہے
پیر و جوان و طفل ہیں بشاش و شادماں
نامہرباں بھی ہو گئے ہیں آج مہرباں
فردوس کا زمیں پہ ہوتا ہے اب گماں
الفت کے نور سے ہوا معمور سب جہاں

ایسی ہلالِ عید کی مقبول دید ہے
ہر ایک نغمہ زن ہے ہر اک گھر میں عید ہے

ہر سمت انبساط ہے ہر گھر میں ہے خوشی
کافور دشمنی ہوئی ہے دورِ آشتی
پوشاک نو ہے آج امیر و غریب کی
بچے بھی مسکراتے ہیں عیدی انہیں ملی

ایسی ہلالِ عید کی مقبول دید ہے
ہر ایک نغمہ زن ہے ہر اک گھر میں عید ہے

روزوں کا حکم تھا جنھیں ماہِ صیام میں
وہ تیس دن لگے رہے نیکی کے کام میں
مسرور و شادکام ہیں اب اختتام میں
پایا صلہ ہر اک نے مہِ نو کی شام میں

ایسی ہلالِ عید کی مقبول دید ہے
ہر ایک نغمہ زن ہے ہر اک گھر میں عید ہے

مصروفِ یادِ حق میں ہر اک پاکباز ہے
سر آج وقفِ سجدہ برائے نماز ہے
اے دل نہ ڈر رحیم ہے وہ کارساز ہے

عاصی کے واسطے بھی درِ توبہ باز ہے
ایسی ہلالِ عید کی مقبول دید ہے
ہر ایک نغمہ زن ہے ہر اک گھر میں عید ہے

اسلام سے یہ مانتا ہوں آشنا نہیں
میری سرشت نیک ہی بس بے وفا نہیں
رحمان ہی ہے رام کوئی دوسرا نہیں
پابندِ قیدِ دیر و حرم کا خدا نہیں
اوتار کو بھی آج بغل گیر کیجئے
اس سے نویدِ عیدِ مبارک کی لیجئے

# حُسن

سنہ ۱۹۳۴ء

اے حُسن تیرا سارے زمانے میں راج ہے
فرماں روائے عشق کے تو سر کا تاج ہے
پڑتی ہے آنکھ تجھ پہ امیر و غریب کی
دولت نگہ ہے تو تو کسی خوش نصیب کی
اترا رہا ہے رنگ ترا جس کو مل گیا
نکہت تری ہے جس میں وہی پھول کھل گیا
تیرے طفیل چاند کا مکھڑا ہے چرخ پر
معدن میں ضو فشاں ہے تری ذات سے گہر
زلفِ بتاں میں ڈال دیئے تو نے خم پہ خم
سیدھا کھڑا ہے سرو یہ ہے تیرا ہی کرم

۳۱

زلفِ سیاہِ یار کو شب رنگ کر دیا
عارض ہیں کوٹ کوٹ کے کیا نور بھر دیا
چشمِ سیاہ یار ہوئی مست و نیم باز
پر درد گار عاشقوں کا اب ہے کار ساز
ناخن کو مرتبہ دیا تو نے ہلال کا
مشاطہ بن کے آئی ترے واسطے حنا
ایسی ہی ہو رہی تھی مری دل سے گفتگو
اور دیدِ حُسن کی تھی بہت مجھکو آرزو
ہنس کر کہا یہ دل نے کہ تو جانتا نہیں
حُسنِ حقیقی کیا ہے یہ پہچانتا نہیں
جس حُسن کی ہے دُھن تجھے اس کو بقا نہیں
تیرے چمن کا گل کوئی غیر از فنا نہیں
تو جس کا ہے فریفتہ وہ تو ہے عارضی
تیری نگاہِ شوق میں مستی نہیں رہی
آ میں بتاؤں تجھکو کہ کیا چیز حُسن ہے
اُترے نہ جس کا نشہ کبھی وہ پلاؤں مے

یہ کہہ کے اُس نے پردۂ غفلت اٹھا دیا    جو تھا حریم ناز میں اس کو دکھا دیا

دیکھا جو میں نے جلوۂ صد برقِ طور تھا
دِل انتہائے شوق سے دار السرور تھا
جلوہ فگن تھا شاہدِ رعنا کہیں جسے
اہلِ نگاہ دِل کی تمنّا کہیں جسے
آنکھیں سرور بخش تھیں شیریں کلام تھا
امن و سکونِ دِل کا یہ کل انتظام تھا
کیفِ ادائے یار سے مسرور ہوگیا
جامِ نشاط بخش سے مخمور ہو گیا
مندر میں دل کے حُسن کی دیوی نظر پڑی
سجدے میں گر پڑا میں بصد عجز و بیکسی

# شباب

سنہ ۱۹۴۴ء

ہے عجب جوشش آفریں پیمانۂ کیفِ شباب
پھر رہا ہے جھومتا مستانۂ کیفِ شباب
تشنہ کامی کا گلہ اے بادہ کش رہ جائے گا
بند ہو جائے گا جب میخانۂ کیفِ شباب
بارگاہِ ساقیِ رعنا کے وہ قابل نہیں
جو رہا اس دور میں بیگانۂ کیفِ شباب
ہے امنگوں پر طبیعت بڑھ چلا جوشِ نشاط
لوگ کہتے ہیں ہمیں دیوانۂ کیفِ شباب
ہیں نظر میں وسعتیں اور طبع میں جولانیاں
ہو گئیں دشواریاں بھی اب ہیں آسانیاں

زورِ بازو پر ہے زعم اور نوجوانی کا گھمنڈ
موت سے ڈرتے نہیں ہے زندگانی کا گھمنڈ

بے نشانِ منزل۔ دیارِ غیر کی دشوار راہ
ہم نہیں ہوتے ہراساں ہے روانی کا گھمنڈ

مفلسی میں بھی امیری کے مزے لیتے ہیں ہم
آبِ کوثر سے سوا ہے گھر کے پانی کا گھمنڈ

بات کرنی بھی نہیں آتی مگر یہ حال ہے
طبعِ موزوں پر ہے ناز اور خوش بیانی کا گھمنڈ

رات دن لیتے ہیں دیوانی جوانی کے مزے
اس میں ہیں مستور ساری زندگانی کے مزے

حسن ہم ہیں عشق ہم ہیں شمع ہم پروانہ ہم
جلوۂ جانانہ ہم ہیں عاشقِ دیوانہ ہم

پارساؤں کی جماعت میں بنے ہم پارسا
حلقۂ رنداں میں پیرِ مسلکِ رندانہ ہم

ہم ستم گر ہم ستم کش ہم مجسم جور و لطف
ہم ہیں جاہل ہم ہیں عاقل مست ہم فرزانہ ہم

خون کے ہر قطرے میں ہے مضمر شرابِ زندگی

مست ہم ساقی بھی ہم ہیں بادہ ہم میخانہ ہم
لطف و کیفِ زندگی ہیں عیش و ذوقِ زندگی

دوڑتا ہے اپنی ہر ہر رگ میں شوقِ زندگی
ہے جوانی خوبیِ حسنِ کتابِ زندگی
ہے یہی پُر لطف اور پُر کیف بابِ زندگی
سازِ ہستی میں ہیں پنہاں نغمہ ہائے دلفریب
ہے بجا کہیے اگر اس کو ربابِ زندگی
شیر خواری کے مزے لیتا ہے کمسن طفل بھی
اس نے پی آغوشِ مادر میں شرابِ زندگی
زندگی کے دن گذارے پیرِ صد سالہ نے بھی
زندگی اس کی ہے لیکن اِک عذابِ زندگی

عالمِ طفلی طلسم آرزو کا نام ہے
عہدِ پیری آدمی کو موت کا پیغام ہے
ہر نشاطِ زندگی اس خوشنما منزل میں ہے
ارتباطِ حسن و عشق اس کیف نا منزل میں ہے
گلرخوں کی صحبتیں ہیں نوجوانوں کو نصیب
دلستانی کا مزا اس دل ربا منزل میں ہے

وصلِ دخترِ رز سے لطف اندوز ہیں اس دور میں
ساقیِ توبہ شکن راحت فزا منزل میں ہے
زندگی میں طفلی و پیری کی بھی ہیں منزلیں
عیش کا خرمن مگر اس بے بہا منزل میں ہے
جلد ہو جاتا ہے لیکن ختم یہ دورِ شباب
پھر وبالِ زندگی ہوتا ہے پیری کا عذاب

# بہار آئی ہے

سنہ ۱۹۳۴ء

ختم ہے دورِ خزاں کا چمن آرائی ہے
پھول جوبن پہ ہیں ہر شاخ میں رعنائی ہے
خندہ زن غنچے ہیں سوسن نے زباں پائی ہے
چشمِ نرگس عجب انداز سے شرمائی ہے

مژدہ مرغانِ گلستاں کہ بہار آئی ہے

پھول پھر گلشنِ عالم میں کھلے ہیں ہر جا
فلکِ پیر نے بھی رنگ نرالا بدلا
باغباں خوش ہیں مسرت سے ہے دل ان کا بھرا
حمدِ باری میں عنادل بھی ہوئے نغمہ سرا

مژدہ مرغانِ نوا سنج بہار آئی ہے

دُرِ شبنم سے مزیّن ہوئی پتّی پتّی
فکر سنبل کو ہوئی زلف کے سلجھانے کی
مژدہ خندہ گُل بادِ صبا پھر لائی
نونہالانِ گلستاں کی ہے ہر آن مئی

شاد ماں پیر و جواں ہیں کہ بہار آئی ہے

سیرِ مہتاب کا ہے لطف اسی موسم میں
بزمِ احباب کا ہے لطف اسی موسم میں
عشقِ بیتاب کا ہے لطف اِسی موسم میں
حسنِ نایاب کا ہے لطف اسی موسم میں

سب کھلے جاتے ہیں پھر فصلِ بہار آئی ہے

آمدِ فصلِ بہاری سے ہیں میکش مسرور
دورِ جامِ مے گلگوں سے ہوئے سب مخمور
اب تو واتار ہمیں بھی ہے مسرت منظور
موسمِ گل میں زمانے کا یہی ہے دستور

شاد ہیں دل کہ گلستاں میں بہار آئی ہے

# برسات

سنہ ۱۹۳۴ء

گرمی سے نجات پا چکے ہیں
دن دھوپ کے اب تو جا چکے ہیں
وہ دن گئے جبکہ ہانپتے تھے
سورج کی نگہ سے کانپتے تھے
ہر لب سے تھی تشنگی نمایاں
آفت میں تھی جب ہر ایک کی جاں
گرمی کی تپش سے جاں بلب تھے
اُف دھوپ کے دن بھی کیا غضب تھے

برسات نے اب جما لیا رنگ
گرمی کا ہوا ہے قافیہ تنگ

بجلی کی چمک دکھانے والی
برسات کی شان ہے نرالی
ہر ایک کو تر بتر کیا ہے
تالاب کو اس نے بھر دیا ہے
دیوار گری یہاں وہاں گھر
ہر ایک ہے قید گھر کے اندر
بازار میں سب پھسل رہے ہیں
بیتاب ہر دل اچھل رہے ہیں

طوفاں ہے بپا سمندروں میں    دل تھامے ہیں لوگ کشتیوں میں
موجیں اٹھتی ہیں آسماں تک    کشتی کو بچائیں گے کہاں تک

دل بیٹھ گیا ہے ناخدا کا
ہے آسرا ایک کبریا کا

اس وقت میں جو ہیں ماہر فن    پانی میں چلا رہے ہیں انجن
دریاؤں کے موتھ کو موڑتے ہیں    نہروں سے انھیں نچوڑتے ہیں
طغیانیِ آب سے ہیں لڑتے    پل باندھ کے ہیں اسے جکڑتے
پانی سے نکالتے ہیں بجلی    بجلی سے ہے روشنی و گرمی

آب اور ہوا سے کام لینا
ادنٰے سا ہے ان کا اک کرشمہ

اٹھی ہیں جو پر فضا گھٹائیں    ساقی کی میں لونگا اب بلائیں
وہ جھوم کے بادل آرہے ہیں    اوتاد کا دِل لبھا رہے ہیں
گردوں پہ سیہ گھٹا پھر اٹھی    توبہ کی ہے اب تو ایسی تیسی
اے دخترِ رز حجاب کیا ہے    کچھ جانتی ہے سحاب کیا ہے
گرمی کی تپش نہیں ہے باقی    بھر دے مئے لالہ رنگ ساقی

بھر بھر کے پلا دے جام صہبا
ہے آج ہی لطف مے کشی کا

# بچپن

سنہ ۱۹۳۴ء

وہ بھولی بھولی باتیں وہ حیلہ وہ بہانا
وہ توتلی زباں سے ہر ایک کو لبھانا
دق کرنا اور مچلنا ضد کرنا منہ پھلانا
بے وجہ روٹھ جانا بے وجہ مُسکرانا
آتا ہے یاد ہم کو بچپن کا وہ زمانا
آغوشِ مادری میں تھا اپنا آشیانا
شاہ و گدا کسی سے دیکھا نہ ہم کو ڈرتے
جو کچھ بھی جی میں آتا اُس کو ضرور کرتے
بے وجہ تھے بگڑتے بے وجہ تھے بپھرتے
بے فکریوں کے دن تھے آرام سے گزرتے

آتا ہے یاد ہمکو بچپن کا وہ زمانا
آغوشِ مادری میں تھا اپنا آشیانا

کھانے کے وقت پوری حلوہ ملائی کھاتے
پینے کے واسطے بھی اچھا سا دودھ پاتے
سونے کے وقت ہم کو جھولے میں تھے جھلاتے
باہر کہیں جو جاتے کاندھے پہ چڑھ کے جاتے

آتا ہے یاد ہمکو بچپن کا وہ زمانا
آغوشِ مادری میں تھا اپنا آشیانا

ہر ایک مرد و زن کے پیر و جواں کے پیارے
محبوبِ عام تھے ہم ہر ایک کے دلارے
چھوٹے بڑے تھے گھر کے نوکر سبھی ہمارے
ماں باپ کی تو گویا آنکھوں کے ہم تھے تارے

آتا ہے یاد ہم کو بچپن کا وہ زمانا
آغوشِ مادری میں تھا اپنا آشیانا

جب سے ہوئی ہے تجھ سے اے کم سنی جدائی
فکروں نے آ کے گھیرا راحت کبھی نہ پائی
جب سے شباب آیا آفت میں جان آئی

اللہ کی دہائی اللہ کی دہائی
اک خواب ہو گیا ہے بچپن کا وہ زمانا
آغوشِ مادری میں تھا جبکہ آشیانا

# رفیقۂ حیات

۱۹۳۴ء

اے شریکِ زندگی اے باعثِ تسکینِ جاں
اے توانائیِ الفت کی شبیہہِ ناتواں
اے نشانِ حسن و عشق اے مرکزِ مہر و وفا
اے رضاؤ بردباری کی شبیہِ خوشنما
اے مجسّم نورِ الفت اے سراپا نورِ حق
اے عزیزِ خالقِ ہر دو جہاں منظورِ حق
اے وسیلِ مہر و الفت منبعِ لطف و کرم
اے حقیقت آشنائے رونقِ باغِ ارم
اے امینِ جوہرِ عصمت حقیقی پارسا
اے نزاکت کی پری محبوبۂ راحت فزا

اے نہالِ آرزو اے فرحتِ جانِ حزیں
اے تمنائے دلِ اوتار اے لطف آفریں

دیکھ کر صورت تری شانِ خدا آئی نظر
حسن کی دیوی ہے تو اور دل تری الفت کا گھر

تو متاعِ خوبی و حسنِ کرم میں بے نظیر
تو حقیقت آشنائی کے سبب روشن ضمیر
تو کلیدِ گنجِ الفت تو دوائے دردِ دل
تو پرستارِ محبت آشنائے دردِ دل
تو گلِ شرم و حیا کی نکہتِ لطف آفریں
تو جگر گوشوں کی میرے انبساطِ اولیں
تو محبت کی نشانی تو مسرت کا سبب
تو ہمیشہ خندہ پیشانی ہمیشہ خندہ لب
تو جوانی میں مری راحت فزائے زندگی
تو مرے ایامِ پیری کی عصائے زندگی
تو شریکِ رنج و غم بھی شاملِ راحت بھی ہے
تو وہ ہے جس سے مرا گھر غیرتِ جنت بھی ہے

وقفِ الفت ہو کے میرا غم مٹا دیتی ہے تو
کھیلتی ہے جان پر درسِ بقا لیتی ہے تو

# پیری

سنہ ۱۹۳۶ء

یاد ہیں وہ دن ہوئے جب آشنائے زندگی
شیرِ مادر نے پلایا تھا برائے زندگی
واردِ ہستی ہوئے تھے ہم عدم کے ملک سے
روح نے قالب میں ڈالی تھی بنائے زندگی
کم سنی جاکر شباب آیا خدا کے فضل سے
کھل گئے جتنے تھے ہم پر رازہائے زندگی
عیش و کیفِ زندگی سے دل سرور اندوز تھا
روز و شب شام و سحر دیکھی فضائے زندگی
آفتابِ زندگانی ڈھل گیا اب شام ہے
قربِ ختمِ زندگی ہے موت کا پیغام ہے

ضعف کا شکوہ ہے اب اور رخصت تاب و تواں
خواب وہ دن ہو گئے جب ہم بھی تھے مرد جواں
لغزشِ پا ہاتھ میں رعشہ بصارت بھی ضعیف
کان بہرے ہیں کمر خمدار مانندِ کماں
زلفِ عنبر فام کے بدلے ہیں اب موئے سفید
جلد تر ان کا بھی مٹنے والا ہے نام و نشاں
ہم چباتے تھے کبھی دانتوں سے لوہے کے چنے
ہو گیا افسوس خالی ان سے اب اپنا دہاں
تن کے سب اعضا ہیں ڈھیلے مبتلائے درد ہیں
سانس ہے اکھڑی ہوئی کہنے کو ہم بھی مرد ہیں
شوقِ رخصت ہو چکا ہے الوداعِ صبر ہے
قصرِ ہستی کا مکیں جو تھا قرینِ قبر ہے
ہو کے نادم محو ہیں اب یادِ حق میں رات دن
اب نظر میں عاصیوں کی رحمتوں کا ابر ہے
زندگی کے لطف پاتے تھے وہ دن رخصت ہوئے
سانس لینا بھی ہمارے واسطے اک جبر ہے
جلوہ افگن قصرِ ہستی میں جو تھا مستِ شباب

ہونے والا چند دن میں آشنائے قبر ہے

جادۂ ہستی کی یعنی آخری منزل ہے یہ

کشتیٔ عمر رواں کے بحر کا ساحل ہے یہ

بادۂ عشرت جوانی تھی تو پیری زہر ہے

کیف کا تھا وہ زمانہ اب ستم ہے قہر ہے

ہم چشم ساقیِ گلفام سے تھے لطف کش

بادۂ انگور اپنے حق میں اب تو زہر ہے

دوڑتا تھا خوں رگوں میں انتہائے جوش سے

اب بصد مشکل رواں تن میں لہو کی لہر ہے

وہ امنگوں کی تلاطم خیزیوں کا تھا سماں

خشک ہونے کے قریب اب زندگی کی نہر ہے

ہوش رخصت ہو رہے ہیں بد حواسی چھا گئی

ختم ہے عہدِ جوانی ہائے پیری آ گئی

# دل

۱۹۳۷ء

دو حرف کی کل یہ داستاں ہے
ناکامیِ عشق کام تیرا
ہشیار تری صدا پہ دنیا
تیری حرکت سے ہے زندگانی
گر تو ہے جواں تو ہیں جواں سب
رگ رگ میں تری ہے جوشِ فطرت
دم بھر میں جو چاہے شاد کر دے
فطرت تری بے نیازِ دانش
پرواز تیری عرشِ پیما

اے حضرتِ دل ترا بیاں ہے
ہے شغل یہ صبح و شام تیرا
نازاں ہے تری وفا پہ دنیا
اور موت کی ہے سکوں نشانی
تو پیر تو میں بھی ناتواں ہوں
ہر سانس رہینِ مہر و الفت
عشاق کو با مراد کر دے
تو وجہِ شکستِ سازِ دانش
مقصد ہے ترا تلاشِ عنقا

تو روح فزا و کیف پرور — تو محوِ ادائے حسنِ دلبر
تو شکوہ سرائے جورِ خوباں — تو مسکنِ آرزو و ارماں
تو موجد و بانیِ تمنا — تو لطف کشِ فریبِ دنیا

عاشق کے لئے وبالِ جاں ہے
معشوق ترا مزاج داں ہے

نرم شیوگی اک صفت ہے تیری — سیماب وشی بہت ہے تیری
بجلی کی تڑپ ہے تجھ سے نادم — قطبین جھکیں جو تو ہو قائم
بیتابیِ برق و صبر تجھ سے — حل عقدۂ قدر و جبر تجھ سے
چاہے تو چہِ ذقن میں ہو قید — پیچ و خمِ زلف کا بنے صید
چاہے تو بغل میں رہ کے ہو دور — دکھلائے صنم میں شعلۂ طور
ظاہر میں تو ہاتھ بھر سے کم ہے — پر معرضِ ہستی و عدم ہے
دنیا ہے ترے ہی دم سے بستی — تو مایۂ افتخارِ ہستی
اے دل تو شباب کی ہے تمکیں — ضعفِ پیری کی وجہِ تسکین
تکوین کا شاہ کار ہے تو — فطرت کے لئے سنگار ہے تو
امید کی جان روحِ ایماں — اے دل تو ہے رہنمائے یزداں
تو زمزمہ زنِ ربابِ ہستی — اے دل ہے تو ہی شبابِ ہستی
سو طرح کے ہیں ترے کرشمے — اک اس میں تیری لاکھ نغمے

آئینہ ہے تجھ پہ رازِ دُنیا — پُر شور ہے تجھ سے سازِ دُنیا
عالم کا نظام تیرے دم سے — سب چلتے ہیں کام تیرے دم سے

چاہے تو خدا سے تُو ملا دے
رُتبہ تو گدا کو شاہ کا دے

تو رہبرِ وادیٔ محبت — تو رہبرِ راہِ مہر و الفت
الفت کے پلائے جام تونے — فرقت کی دکھائی شام تونے
دھڑکن ہے تری نظامِ الفت — روشن ہے تجھی سے نامِ الفت
اُٹھتا ہے کہیں تو درد بن کر — جلتا ہے کہیں تو مثلِ اخگر
فرقت میں جلائی جان تونے — غربت میں مٹائی شان تونے
سوتے فتنے جگائے تونے — اور حشر پہ حشر اٹھائے تونے
قسمت میں تری ہے بیقراری — فریاد و فغان و آہ و زاری
خوں بن کے ٹپک رہا ہے پیہم — ہم صورتِ اشک چشم پر نم
تو محرمِ رازہائے پنہاں — تو راہبرِ راہِ دین و ایماں
پہلو میں تو خار بن کے کھٹکا — نظروں میں کسی کی جا کے اٹکا

فرہاد کو کوہکن بنایا
اور قیس کو دشت میں رلایا

مجبور کہیں کہیں ہے رنجور — مسرور کہیں کہیں ہے مغرور

آباد کہیں کہیں ہے برباد — محدود کہیں۔ کہیں ہے آزاد
عابد ہے کہیں۔ کہیں ہے معبود — مقصد ہے کہیں۔ کہیں ہے مقصود
طالب ہے کہیں۔ کہیں ہے مطلوب — راغب ہے کہیں۔ کہیں ہے مرغوب
ناصح ہے کہیں۔ کہیں ہے زاہد — مشہود ہے تو ہی۔ تو ہی شاہد
پروانہ میں بے نیاز پر ہے — سوزش میں نمونۂ شرر ہے
جس سمت نظر اٹھائی تو نے — اک اور فضا دکھائی تو نے

ہر اک سے جدا ہے ڈھنگ تیرا
ہر وقت نیا ہے رنگ تیرا

تعریف تری کروں کہاں تک — پہنچا ہے زمیں سے آسماں تک
غمخوار ہے غمگسار ہے تو — ہمراز ہے میرا یار ہے تو
تھا بزم طرب میں تو ہی ساقی — رندوں کو ہے تیری یاد باقی
اوتار بھی ایک خستہ جاں ہے — پامال و نحیف و ناتواں ہے
اس کو بھی ذرا سکوں عطا کر — اس کی بھی قبول التجا کر

تو اس کو بھی شاد کام کر دے
دامن میں گل مراد بھر دے



سورگباشی سوشیلا دیوی ٹکّو زوجہ محترم مُصنّف

# رقیہ حبیبات کے انتقالِ پُر ملال پر

۱۹۴۶ء

او تارا کہوں میں کیا تم سے تقدیر ہی میری پھوٹ گئی
جس شاخ پہ جھولا ڈالا تھا وہ شاخ نشیمن ٹوٹ گئی

جب تک تھا جوانی کا عالم۔ ہم لیتے تھے اس دُنیا کے مزے
وہ بارِ ضعیفی نے ڈالا۔ ہمت کی کمر ہی ٹوٹ گئی

باندھی تھی بہت اقراروں سے مضبوطی پر تھا ناز مجھے
ایمان و محبت کی وہ گرہ برسوں کی پُرانی ٹوٹ گئی

ارمان بہت سے شوق بہت سے دِل میں میرے بستے تھے
جب تو نے مونھ کو موڑ لیا۔ اس دل کی بستی ٹوٹ گئی

اس گھر کی رونق تجھ سے تھی۔ اس گھر کی عزت تجھ سے تھی
جب تو نے گھر کو چھوڑ دیا۔ اس گھر کی ہستی ٹوٹ گئی

سب دنیا میری تجھ سے تھی۔ تھا ناز محبت کا تیری
جب تو نے مجھ کو چھوڑ دیا۔ وہ دنیا میری ٹوٹ گئی

او تار ہوا غمخوار ہے اب۔ تھا شاد بہت ناشاد ہوا اب
جو قصرِ مہر و الفت تھا۔ بنیاد ہی اس کی ٹوٹ گئی

سنہ ۱۹۴۶ء

بڑھاپے میں مجھ سے دغا کر گئی ہے — وفا کرنے والی جفا کر گئی ہے
مری بیماری پر جو قضا کر گئی ہے

پڑے میری تقدیر پر ہائے پتھر — ہوا جیتے جی آج مردوں سے بدتر
یہ کیسی قیامت بپا کر گئی ہے

محبت کا میں نے صلہ کچھ نہ پایا — مرے حال پر رحم تجھ کو نہ آیا
یہ کیا کر گئی ہے۔ یہ کیا کر گئی ہے

نہ کیوں اشک نکلیں مری چشم نم سے — بندھی تھیں امیدیں بہت تیرے دم سے
مری ساری دنیا مٹا کر گئی ہے

غضب ہو گیا مجھ سے کیوں منھ کو موڑا — تڑپتا ہوا درد فرقت میں چھوڑا
بتا تو سہی تو یہ کیا کر گئی ہے

اے آرام کی نیند میں سونے والی غمِ زندگی سے رہا ہونے والی
مجھے غم میں کیوں مبتلا کر گئی ہے
جو آباد کل تھا وہ برباد ہے اب یہ اوتار غمخوار ناشاد ہے اب
اسے خاک میں کیوں ملا کر گئی ہے

## سنہ ۱۹۴۶ء

ہو چکی اب اشکباری ہو چکی — نوحہ خوانی۔ آہ وزاری ہو چکی

زلت کی غفلت شعاری ہو چکی — میکدے کی بادہ خواری ہو چکی

چارہ گر سب چارہ جوئی کر چکے — دوستوں کی غمگساری ہو چکی

نامرادوں کو بھی ضبط آہی گیا — آہ کی بے اختیاری ہو چکی

درد جب حد سے بڑھا صبر آگیا — اب سکوں ہے بیقراری ہو چکی

دشمنوں سے دشمنی جاتی رہی — دوستوں سے دوستداری ہو چکی

نام کی اب آرزو مطلق نہیں — شانِ تمکین و وضعداری ہو چکی

پھر مجھے ہوشِ فنا آہی گیا — زندگی جب ختم ساری ہو چکی

اس کی دُھن میں کیوں لگے ہو غافلو! — ہو چکی دنیا تمھاری ہو چکی

خدمتِ حق بھی کریں اب کچھ دن — دہر کی خدمت گذاری ہو چکی

زندگی سے کام کیا غم خوار کو　　　موت اب تو اس کو پیاری ہو چکی

اور شاعر خوش نوا ہونے کو ہیں
آپ کے رونے کی باری ہو چکی

# عورتوں کے حقوق

(از جنابہ سوشیلا دیوی زوجہ محترمہ مسٹر اوتار کرشن کمو مصنفہ)

سی۔ پی لیڈیز کانفرنس بلاسپور میں ۱۹۳۴ء میں پڑھی گئی

ایک کن سے کل نظام عالمِ امکاں ہوا
جس گھڑی ڈالی گئی تعمیر ہستی کی بنا
نیلگوں گنبد بنایا جو ہے شکلِ آسماں
چاند اور تاروں سے پھر اُس کو مزین کر دیا
مہر تاباں کو بنایا نور بھی اور نار بھی
مخزنِ لطف و کرم بھی باعثِ قہر و جفا
مرکزِ خاکی بنایا زیر چرخِ نیلگوں
جس پہ رہنے کے لئے انسان کو پیدا کیا
قصرِ ہستی کی مکمل ہو گئی تعمیر جب
رب کو یہ منظور تھا قائم رہے یہ سلسلہ

قصہ یہ بھی تھا کہ ہو اک صنفِ نازک کا ظہور
شانِ قدرت تیرے قرباں کیا دکھایا معجزہ
ہستیٔ نسواں ہی وہ اک ہستیٔ ذیشان ہے
نسلِ آدم کو بڑھانے کا جسے امکان ہے
اہلِ محفل غور سے سنیئے گا اب میرا بیاں
طبقۂ نسواں کی کرتی ہوں بیاں کچھ خوبیاں
شاستروں نے مرد کی اردھنگنی ہم کو کہا
اور بیٹر ہاف کہتا ہے ہمیں سارا جہاں
نورِ الفت سے ہمارے قلب یوں معمور ہیں
بے بجا کہئیے اگر مہر و وفا کی دیویاں
زورِ بازو پر بہت مردوں کو ناز و زعم ہے
ہیں تحمل اور شکیب و صبر کی ہم پتلیاں
بھیم و ارجن سے مرد گذرے ہیں دلاور اور شجاع
دروپدی اور پدمنی سی ہم میں بھی تھیں رانیاں
رام چندر نے پتا کا گر بچن پالن کیا
تھی پتی برتا دھرم میں سیتا بھی یکتائے زماں
عقل میں کچھ کم نہیں شکل میں بہتر ہیں ہم ہے ہزار افسوس لیکن اس پہ بھی کھاتی ہیں غم

تابعِ فرماں رہیں ہم اور پابندِ مکاں
بیٹھکر پردہ میں چھپائیں پھر ہزاروں سختیاں
مرد جو چاہیں کریں آزاد ہیں مختار ہیں
ہم پہ ہیں ہر گام پر مجبوریاں پابندیاں
کیوں نہ ہم چلائیں چیخیں شیوۂ بیداد پر
کیوں نہ ہوں فریاد گستر ہم بھی رکھتے ہیں زباں
ایک پہیے کی کبھی گاڑی چلا کرتی بھی ہے
گر کماں ٹوٹی ہوئی ہو تیر بھی ہے رائگاں
آگیا آزادیِ نسواں کا اب وقتِ سعید
مدتوں کے بعد پاؤں کی کٹی ہیں بیڑیاں
پائے ہیں کچھ اور باقی پائینگے اپنے حقوق
کونسلوں میں ملک کی اب رائے دینگی بیگماں

پیاری بہنو! آپ کی لیکن مدد درکار ہے
پھر خدا نے چاہا تو اپنا بھی بیڑا پار ہے

اتفاقِ باہمی سے کرکے کچھ دکھلائیے
جو کہ ہوں گمراہ بہنیں رہ پر ان کو لائیے
عورتوں کے فرض جو ہیں سب رہیں مدِ نظر

مائیں بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں بن جایئے
گود میں ملتا ہے ماں کی درس اوّل طفل کو
مکتبِ آغوشِ مادر میں اسے بہلایئے
کھیلنے کے ساتھ ہیں اس عہد میں پڑھنے کے دن
کمسنی میں ننھی ننھی بچیاں کیوں بیاہیے
شوق آرائش ہو بہتر ذوق زیبائش درست
لڑکیوں کو زیورِ تعلیم بھی پہنایئے
لڑکیوں کو دیجیے تعلیم کالج کی مگر
سب امورِ خانہ داری بھی انھیں سکھلایئے
دست بستہ عرض کرتی ہے سو شیدہ مانیے
پیاری بہنو سوچیے سود و زیاں پہچانیے

# تمت بالخیر